آپ بیتی

[حیاتِ غوث]

خود نوشت سوانح حیات

حافظ، قاری، مولانا ڈاکٹر محمد غوث ندوی

بانی وصدر دار العلوم الاسلامیہ بأمریکا

کیلیفورنیا۔ امریکہ

آپ بیتی

[حیاتِ غوث]

خود نوشت سوانح حیات

حافظ، قاری، مولانا ڈاکٹر محمد غوث ندوی
بانی و صدر دارالعلوم الاسلامیہ بامریکا
کیلیفورنیا۔ امریکہ

(حسابِ جزوکل)

نام کتاب "حیات غوث (آپ بیتی)"

- (خود نوشت سوانح حیات)

نام مؤلف حافظ قاری مولانا، ڈاکٹر محمد غوث ندوی

تعداد اشاعت ایک ہزار

سن اشاعت ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۹۹۶ء

سرورق خطاط العصر عالی جناب محمد عبدالسلام صاحب

مقام طباعت اویس گرافکس - حیدرآباد

کمپیوٹر کتابت جناب جلال الدین اکبر - فون نمبر 4530850

- 17-1-181/M/35 - روبرو جامعہ عائشہ نسوان (نیو بلڈنگ)

- دارالب جنگ کالونی - مادناپیٹ - حیدرآباد ۵۹ (اے - پی) -

حقوق اشاعت بحق مؤلف محفوظ

===== کتاب ملنے کے پتے =====

(۱) سید ارشد 1-9-9/C ، جدید نمبر (80) رام نگر،
حیدرآباد 48 آندھراپردیش، انڈیا

(۲) ڈاکٹر محمد غوث ندوی - بانی و صدر دارالعلوم الاسلامیہ بامریکا
2012. Mallory St. CAL - 92527 U.S.A

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فان مع العسر یسرا
ان مع العسر یسرا

(صدق اللہ العظیم)

OOOOOO

حافظ بلا میں یار بھی اغیار بن گئے
قسمت بدل گئی تو زمانہ بدل گیا

OOOOOO

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آپ بیتی (حیات غوث)

(خود نوشت سوانح حیات)

حافظ وقاری مولانا ڈاکٹر محمد غوث ندوی
(بانی وصدر دار العلوم الاسلامیۃ بأمریکا)
کیلیفورنیا۔امریکہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آپ بیتی (حیات غوث)

حرف آغاز

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ،اَمابعد

عزیزوں ، دوستوں اور مخلصوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کا اصرار ہے کہ ۵۶ / ۵۷ سال کی عمر کا ایک پیر نابالغ اپنی آپ بیتی دوسروں کو سنائے ، اور نادانیوں ، سیاہ کاریوں کی لمبی سرگزشت دنیا کے سامنے اپنی زبان سے دہرائے ۔

اللہ جانے انسان کو انسان کی پستیوں ، رسوائیوں ، فضیحتوں کی داستان سننے میں کیا مزہ آتا ہے ! اور یہاں تو خیریت سے سادہ بندوں کا ایک جم غفیر اس دھوکے میں پڑا ہوا ہے کہ جلوے کسی حافظ اور عالی شہرت یافتہ قاری اور عالم و فاضل کے ان صفحات میں دیکھنے میں آئیں گے یا کچھ مواعظ ، عارف باللہ کے سننے میں آئیں گے ! اللہ اللہ ! اس عالم آب و گل میں اللہ کی صفت ستاریت نے کیسے کیسے پردے مجرموں اور خاطیوں کے چہروں پر اور اچھے اچھے حاملین دانش و بصیرت کی فہم و نظر پر ڈال رکھے ہیں ۔

بہرحال خوش فہمیوں میں مبتلا رہنے والے ، اپنے فعل و عمل کے ذمہ دار و مختار ہیں ۔ یہاں تو صرف یہ دعا لپنے پیدا کرنے والے سے ہے کہ ، جو کچھ آپ بیتی ہے وہ بے کم و کاست سپرد قلم کر ڈالنے کی توفیق اس کم ہمت کو ہوجائے ۔ بہرحال آرزو و کوشش کے ساتھ دعا بھی بندے کی یہی ہے کہ واقعہ نگاری میں قلم کا دامن کذب

صریح وافتراء مبین سے آلودہ نہ ہونے پائے، اور اس دعا کا قبول کرنا تو بس اسی کے ہاتھ میں ہے، جو سارے عالم کا پروردگار ہے۔

اپنی آپ بیتی کی تحریک گزشتہ دو سال (۱۹۹۴-۱۹۹۵) سے برابر ہو رہی تھی، بار بار قلم اٹھا کر روک دینا پڑا، آخری بار پرزور تحریک اس طرح ہوی کہ میں امریکہ سے ہندوستان فون پر میرے محسن دوست مولانا محمد عمران اعظمی عمری صاحب۔ مصحح دائرۃ المعارف سے گفتگو کر رہا تھا اور اس گفتگو میں میری زندگی کے بعض اچھے برے پہلو سامنے آئے تو موصوف نے فرمایا کہ "غوث" تم کو اپنی آپ بیتی لکھنی چاہیے کہ اس میں سامان عبرت کے ساتھ ساتھ بہت سے خوشگوار پہلو بھی ہیں، تمہاری آپ بیتی سے پڑھنے والوں کو ایک عزم وحوصلہ ملے گا اور اللہ نے چاہا تو فائدہ ہی پہنچے گا۔ اس کے بعد میں، تقریباً ایک ماہ تک غور و فکر کرتا رہا، اب یہ سطریں اللہ کا نام لے کر آج پیر ۱۲/ اگست ۱۹۹۶ء مطابق ۲۶/ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ کو شروع کر رہا ہوں، آئندہ کا حال بس اللہ ہی جانے۔

حسب روایت حضرت شیخ سعدیؒ، لوگوں نے حضرت لقمانؑ سے پوچھا کہ یہ تمیز و دانش کس سے سیکھی؟ جواب ملا کہ بے تمیزوں اور بے ہنروں سے، جو حماقتیں ان میں دیکھیں بس ان سے احتیاط برتی۔ عجب کیا ہے کہ اللہ کے بعض بندے کچھ اسی نوعیت کے سبق اس خرافات نگاری سے حاصل کر لیں، اور اس کوڑے کے ڈھیر کو کرید کر عبرت کے کچھ موتی اس سے چن لیں، اور جس نے ساری عمر تباہ کاری کی نذر کر دی، اس کے بگاڑ سے اپنے بناؤ کا کچھ سامان فراہم کر لیں۔

بہرحال لکھنے والا اپنے حق میں دعائے خیر و مغفرت کی درخواست اپنے ہر پڑھنے والے سے بہ صد منت و لجاجت کر رہا ہے۔ ازراہ کرم دعا فرمائیے، اور رب العالمین سے اپنا اجر پائیے۔

محمد غوث ندوی

باب (۱)

ماحول

سب سے پہلے اس ماحول کو سمجھ لیجئے، جس میں اس سیاہ کار نے آنکھیں کھولیں بیسویں صدی عیسوی کے وسط کے قبل کا دہا ہے یعنی ۱۹۴۰ء، ہندوستان میں برطانیہ کے عہد و اقبال کا دور تھا، اور حیدرآباد ایک آزاد ریاست تھی، جس میں اعلیٰ حضرت آصف سابع میر عثمان علی خاں بہادر کی حکومت تھی، مسلمانوں کا تناسب پوری ریاست میں صرف ۲۰/ فیصد تھا، لیکن یہ مملکت سارے مسلمانان ہند کا ملجا و ماویٰ تھی، مملکت آصفیہ پوری ایک ریاست نہیں، بلکہ پوری سلطنت تھی، اپنا سکہ اپنی ڈاک، اپنی ریل وغیرہ۔

مملکت آصفیہ کی عام فضا خوش حال اور اس میں دولت کی ریل پیل تھی، مسلمانوں کا ہر طرح غلبہ تھا، کیا مجال کہ کوئی غیر مسلم کسی بھی غریب مسلمان پر ہاتھ اٹھائے بلکہ اس تصور سے وہ کانپ جاتا تھا، نائی دھوبی بہشتی (سقہ) دھنیے جلاہے، لوہار، بڑھئی معجی، مزدور، کسان، قلی وغیرہ، سارے اہل پیشہ کمینے اور ذلیل سمجھے جاتے تھے، اور شرافت کا معیار یہ ٹھیرا تھا کہ نسب میں "میاں لوگوں" کی ٹکر کا کوئی بھی نہیں، اور اونچی اور شریف ذاتیں صرف شیخ و سید میں محدود ہو کر رہ گئی تھیں، اور ان میں بھی تفاضل، اور شیخوں کی شیخی کی تو کوئی حد ہی نہیں، اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنا سو عیبوں کا ایک عیب، اور سو ذلتوں کی ایک ذلت باور کی جاتی، خدمتی پیشے والے نائی کنجڑے قصائی چمار و موچی سب پرجا یا رعایا کہلاتے تھے، ان کی نہ کوئی عزت نہ ان کی عورتوں کی کوئی اہمیت، میاں لوگ ان سب کے مقابلہ میں فرعون بے سامان بنے ہوئے تھے، مجال نہیں کہ جب کوئی میاں اپنے بیٹھکے میں بیٹھے تو کوئی نیچ

قوم کا لڑکا یا جوان ان کے سامنے سے کسی سواری پر بخیر و عافیت گزر جائے۔

ہندوؤں میں برہمن اور چھتری کے علاوہ بقیہ ذاتیں، دھیڑ، چمار ڈکالور، ڈمالور، مادیگور (جن کو آج ہریجن کہا جاتا ہے) وہ سب نہایت ذلیل اور اچھوت سمجھے جاتے تھے، اور مسلمانوں یا برہمن کے کنویں سے پانی تک نہیں سینچ سکتے تھے۔

"ممندہ" ایک جاگیری قصبہ تھا، آبادی کوئی ۳ ہزار ہوگی، دو تہائی ہندو اور ایک تہائی مسلمان، قصبہ کا حاکم مسلمان جاگیردار تھا، یہ قصبہ ضلع نلگنڈہ میں واقع ہے، اور حیدرآباد دارالسلطنت سے کوئی ۶۷ میل دوری پر مشرقی سمت میں واقع ہے، اس وقت یہاں پر نہ ٹرین کا راستہ تھا اور نہ ہی بس کا، نہ ڈاک خانہ اور نہ ہی پولیس کی چوکی، نہ تار گھر اور نہ ہی اسپتال اور نہ ہی سرکاری و خانگی اسکول، ضرورت کی ساری چیزیں نلگنڈہ ضلع سے پوری کی جاتیں جو وہاں سے ۲۴ میل کی دوری پر واقع ہے۔ ڈاک کا نظم یہ تھا کہ، اس قصبہ کے قریب "امن بول" ایک قصبہ تھا وہاں سے ہفتہ میں ایک بار ڈاکیہ خطوط لاتا۔ آج جب یہ سطور لکھی جارہی ہیں، اس قصبہ میں صرف ایک مدرسہ تحتانیہ اور ایک ڈاک خانہ ہے، اور بس کا راستہ بن گیا ہے، لیکن اب بھی یہ انتہائی پسماندہ علاقہ ہے۔

OOOOOOO

پڑ دادا

حضرت شیخ لطیفؒ میرے پڑدادا تھے، ان کا وطن ورنگل تھا، جہاں وہ بڑے رئیس کبیر اور عالم و فاضل شخصیت کے آدمی تھے، ان کی دو اولاد تھیں (۱) حضرت شیخ میرانؒ (۲) حضرت شیخ داؤدؒ، ان دونوں بزرگوں نے ورنگل سے نلگنڈہ نقل مکاں کیا اور جاگیر ممندہ میں بڑی جائیداد پیدا کی، بڑے دادا حضرت شیخ میراں کی چار لڑکیاں تھیں اور کوئی لڑکا نہ تھا، اور میرے دادا حضرت شیخ داؤد کو چار لڑکے تھے اور کوئی لڑکی نہ تھی، شیخ میراں ہمارے دادا شیخ داؤد کے بڑے بھائی تھے، جو نہایت جہاں دیدہ ذکی و ہوشیار قسم کے آدمی تھے، ان کی نرینہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے اپنی جائیداد کی حفاظت کے لئے عجیب و غریب حربے اختیار کئے، اور ہمارے خاندان کی ایک بڑی جائیداد (ان کی اپنی سسرالی کہہ کر) ہمارے دادا محترم سے چھین لی، ہمارے دادا ان سے عمر میں بہت چھوٹے تھے، وہ بیچارے ہائیں ہائیں کہہ کر رہ گئے، اور کچھ نہ کرسکے، ان کی چار نرینہ اولاد تھیں، یعنی مولوی حیات علی، ہمارے والد بزرگوار مولوی غلام محی الدین، مولوی شیخ بندہ علی اور مولوی امیر علی، اور ان سب کی بھی کثیر اولاد تھیں، یعنی تایا صاحب کی ۹ اولاد، ہمارے والد ماجد کی ۱۵ اولاد، بڑے چچا کی ۵ اولاد اور چھوٹے چچا کی ۴ اولاد۔ اس لئے ان سب نے بڑی پریشانی و ناداری میں زندگی بسر کی، جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی۔

ہمارا خاندان جو ورنگل میں تھا، حضرت شاہ افضل بیابانیؒ (قاضی پیٹ) کے مریدوں میں رہا، اور جو بزرگ نلگنڈہ آئے، وہ حضرت سید لطیف شاہ ولیؒ کے خاندان کے مرید رہے، اور ہمارے والد بزرگوار حضرت سید عبداللہ شاہؒ صاحب حیدرآبادی کے مرید و مسترشد تھے۔

جد امجد

جد امجد کا نام نامی اسم گرامی مولوی شیخ داؤد تھا، ان کا اصل وطن ضلع ورنگل تھا۔ زمیندار اور صاحب وجاہت آدمی تھے، کثیر العیال ہونے کی وجہ سے ممندہ ضلع نلگنڈہ منتقل ہوگئے، جہاں وہ ایک زمیندار کی حیثیت سے مشہور و معروف تھے، اس سیاہ کار آنکھوں نے ان کو نہیں دیکھا، وہ میری پیدائش کے قبل ہی انتقال فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نوٹ : داداجان کے حالات زندگی پولیس ایکشن کے ابتلاء اور خاندان کے اجڑجانے سے معلوم نہ ہوسکے، بزرگوں سے سنا ہے کہ بڑے اللہ والے اور خدا ترس انسان تھے۔ رحمہ اللہ رحمۃ تامۃ۔ آمین

خاندانی شجرہ

میرا خاندانی شجرہ باوجود ہزار کوشش کے دستیاب نہ ہوسکا، میں نے ایک بار حضرت والد صاحب قبلہ سے اس بابت دریافت کیا تھا کہ ہم شیخ ہیں یا سید ؟ اور ہمارا خاندانی نسب نامہ کہاں جاکر ملتا ہے ؟ اس پر وہ مسکرا کر خاموش ہوگئے، میں نے اس سکوت کو توڑا، اور کہا کہ آپ اس سلسلہ میں ضرور ارشاد فرمائیں، تو انھوں نے کہا " میں نے والد محترم سے سنا تھا کہ ہم سید ہیں، لیکن اس بارے میں، میں احتیاط کرتا ہوں، میرے والد صاحب کا نام شیخ داؤد تھا، یہ لفظ شیخ ان کی بزرگی (سید ہونے) کی وجہ سے تھا یا وہ خاندانی شیخ تھے مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ بڑے علم و فضل والے صاحب تقویٰ بزرگ تھے، میں نے ایک دن ان سے سنا تھا کہ ہمارے جد اعلی بغداد سے شاہ جہاں کے دور میں دہلی (ہندوستان) آئے تھے، جو بڑے عالم و فاضل اور صاحب کمال بزرگ تھے، شاہ جہاں نے ان کو اپنے لڑکے

محی الدین اورنگ زیبؒ کا اتالیق (استاذ) مقرر کیا تھا، اور اورنگ زیبؒ جب دکن پر چڑھائی کے لئے حیدرآباد آرہے تھے تو وہ اپنے استاذ (ہمارے جد اعلیٰ) کو اپنے ساتھ لے آئے، اور حیدرآباد کا قاضی مقرر فرمایا اور ہمارے یہ بزرگ (جد اعلیٰ) حضرت پیران پیر سید عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے جن کا نام حضرت سید محمد عبداللہ بن عبدالرزاق بن شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تھا۔ پھر یہ خاندان حیدرآباد سے ضلع ورنگل پھر ضلع نلگنڈہ کس طرح منتقل ہوا کب ہوا، اس کی کوئی کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ غرض اللہ تعالیٰ کے ہاں اصل نسبت صرف تقویٰ کی ہے "ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم" اور اسی نسبت کی ہمیں فکر کرنی چاہیئے"۔

باب (۲)

والد ماجد

۱۸۹۳ء _ ۱۹۶۲ء

دادا صاحب نے اولادیں کل چار چھوڑیں، چاروں لڑکے، دوسرے لڑکے میرے والد مرحوم تھے۔ نام مولوی غلام محی الدینؒ، پیدائش ۱۸۹۳ء میں ہوی، ابتدائی تعلیم "امن بول" قصبہ میں ہوی، باقاعدہ مولوی تو نہیں تھے لیکن دین کا ضروری علم رکھتے تھے، اپنے اخلاقی و علمی تجربوں سے خلق کثیر کو فائدہ پہنچایا، بیعت و ارادت حیدرآباد کے شیخ وقت حضرت مولانا سید عبداللہ شاہؒ سے رکھتے تھے۔ اپنے ذاتی اعمال و کردار میں پختہ مسلمان تھے، نماز روزہ ذکر و اذکار کے پابند تھے اور برتاؤ مسلم و غیر مسلم سب کے ساتھ نرمی، رواداری و ہمدردی کا رکھتے تھے، اور ہر شخص کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک سے پیش آتے، اس لئے بحد نیک نام اور ہر دل عزیز

اپنوں اور بیگانوں سب میں رہے، شیریں بیانی ایسی تھی کہ ہندو مسلم سبھی کو موہ لیتی، بے ضرورت بات نہ کرتے، اگر کرتے تو چند جملوں میں ختم کرتے، شرم و حیا کے پیکر اور تقویٰ و پرہیزگاری کا نمونہ تھے، میرے بچپن میں، میں نے دیکھا اور سنا کہ اکثر ہندو ان کو "گرو" اور مولوی اور اللہ والے کے نام سے پکارتے اور اپنے مسائل میں ان کی رائے کی عزت کرتے، پولیس ایکشن میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر بڑے ظلم ڈھائے، ہمارے خاندان کے ایک ایک فرد کو قتل کیا لیکن انھیں نہیں ستایا، سنا ہے کہ مقامی ہندو ایک رات آئے اور ان سے کہا کہ آپ ہمارے گرو ہیں، ہم نے آپ سے ہمیشہ فیض پایا اور آپ کی زندگی میں ہم کو آپ سے کبھی بھی ضرر نہیں پہنچا ہے اس لئے آپ اپنے بچوں سمیت نلگنڈہ ہجرت فرمائیں، اور پاسبانی کے لئے انھوں نے بارہ ہندو نقیب ساتھ کئے۔ چنانچہ وہ اپنی اولاد کے ساتھ نلگنڈہ چلے آئے۔

حضرت والد محترم کی صورت و شکل مولویانہ، قدرے دراز جسم، جامہ زیب، رنگ گندمی، سرخی مائل چہرے پر شرعی خوشنما داڑھی، لباس میں کرتا، پاجامہ، لنگی، عید و خوشی کے موقع پر کبھی کبھی شیروانی، گرمیوں میں دوپلی ٹوپی، جاڑوں میں ترکی سرخ ٹوپی، سر پر اکثر سفید اور کبھی کبھی سیاہ عمامہ، جو ان کے گورے چٹیلے اور گول چہرہ پر بہت ہی بھلا لگتا۔ معاش کا ذریعہ زمینداری تھا، خدام و نوکر تھے جو اس کام کو انجام دیتے تھے، والد ماجد بھی اکثر ان کا ہاتھ بٹاتے اور اپنی زراعت کی نگرانی خود فرماتے۔ میں نے انھیں بچپن میں ناگر ہل جوتتے اور کنویں سے بیلوں کے ذریعہ پانی سینچتے دیکھا ہے اور اپنی بیل گاڑی خود چلاتے ہوئے بھی دیکھا ہے، روزانہ کے معمولات یہ کہ منہ اندھیرے سے اٹھتے، نماز فجر کے بعد تلاوت و وظیفہ میں مشغول رہتے، پھر نوکروں کو اس دن کے کام کی ہدایت فرماتے اور کبھی کبھی خود بھی ساتھ تشریف لے جاتے، تو ظہر سے قبل آجاتے، پھر ناشتہ کرتے اور دن چڑھے ملنے ملانے کے لئے کچھ لوگ آگئے تو ضرورت کی حد تک بات کرتے، اکثر پیر و جمعرات کو قصبہ کے

مقدموں کے ایک حکم [جج] ہوتے ۔ وہ اکثر مودو میاں کے نام سے پکارے جاتے تھے جو میرے والد ماجد کا ہندوؤں کے پاس پیار ا بگڑا ہوا نام تھا جو محی الدین کا مخفف ہے ۔ ظہر کے بعد کھانا تناول فرماتے پھر قیلولہ کرتے ، مجھے یاد ہے کہ اس وقت میں ان کے پیروں کو دباتا ، دبا دبا کر انھیں سلاتا اور خود بھی ان کے پیروں پر سو جاتا تو میری والدہ ماجدہ مجھے سیدھے سلادیتیں ، اس طرح عصر اور مغرب کے بعد عشاء اول وقت پڑھتے اور ہم سب کو ساتھ لے کر سوتے اور اچھی اچھی کہانیاں سناتے تو ہم سو جاتے ۔ بعض عمدہ کہانیاں اور کہاوتیں مجھے اب تک یاد ہیں ، یاد رہے قصبہ ممندہ کا یہ زمانہ بڑی مشکل سے میری عمر کے چھ سال کا زمانہ ہوگا ، پھر زمانے نے وہ قلابازی کھائی کہ پولیس ایکشن کے بعد ہم والدین کی قریبی عنایات سے یکسر محروم ہوگئے ، اور جہاں رہے ، تڑپ تڑپ کر انھیں یاد کیا اور دھاڑیں مار مار کر خوب روئے ، اس ابتلاء و مصائب کے زمانہ کی تفصیل آگے آئے گی ۔ غرض ، بچپن کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا ۔

والد ماجد کا پروگرام لکھتے لکھتے خود اپنی نادانی ، غیر ذمہ داری اور معصومانہ شرارتوں کا زمانہ کس حسرت کے ساتھ نظروں کے سامنے پھر گیا ۔ آہ ! اس وقت کیا خبر تھی کہ یہ کھیل کود کا زمانہ چشم زدن میں ختم ہو جائے گا ، اور بڑے ہو کر کیسی کیسی فکریں اور ذمہ داریاں سر آپڑیں گی ، اور زندگی کو کن کن مشکلات کا مقابلہ ، اور کیسے کیسے اندرونی اور بیرونی فتنوں کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ یہ واقعات پدری جو میں آپ کو سنا رہا ہوں یہ ابتدائی شعوری زندگی یعنی تین سال سے سات سال کی عمر کا زمانہ ہے ، اس کے بعد زمانہ کی ستم ظریفی نے ہم کو ان کے زندہ ہوتے ہوئے بھی جدا کر دیا تھا ، کبھی کبھی حالات ان سے ملاتے تو حسرت بھری نگاہ سے ان کو اور والدہ محترمہ کو دیکھ لیتے ۔ غرض وہ اپنوں اور غیروں پر سایہ ، رحمت تھے ، اور خصوصاً ان کی عنایات مجھ پر بے انتہا تھیں ۔

میری زندگی کے ۶ سال سے لے کر ۲۳ سال تک میں والدین سے جدا رہا ، گو

اس درمیان میں گاہے بگاہے ان سے ملتا رہا اور خیریت کے خطوط لکھتا رہا، اور توفیق بھر خدمت بھی کرتا رہا، لیکن حق خدمت ادا نہ کر سکا، یہ میری تعلیمی زندگی کا زمانہ تھا۔ حیدرآباد میں دارالاقامہ میں رہا یا پھر مدراس میں اور دارالعلوم ندوۃالعلما۔ لکھنؤ میں رہا۔ الحمدللہ اس پورے عرصہ میں، میں ہمیشہ ان کو خوش رکھتا رہا اور ان کی حتی المقدور خدمت بھی کرتا رہا۔

حضرت والد ماجد ۱۹۶۲ء میں میری ہمشیرہ کی شادی کے فوری بعد سخت علیل ہوے، حیدرآباد میں علاج کروایا گیا، ان دنوں میں دارالعلوم ندوۃالعلما سے والد ماجد کی خدمت کے لئے آیا ہوا تھا، ایک ماہ کی علالت کے بعد، انھیں کے حکم سے انھیں ممندہ لیجایا گیا، وہاں ایک ہفتہ بعد جبکہ حضرت کی طبیعت خاصی اچھی ہو چکی تھی، حکم فرمایا کہ بیٹے ! اب تعلیم میں حرج نہ کرو ندوہ جاؤ اور علم دین کی تکمیل کرو، دوسرے دن میں ممندہ سے دست بوسی و قدم بوسی کے بعد رخصت ہوا، رخصتی کے وقت والد مرحوم کی آنکھوں سے آنسو زار و قطار جاری تھے۔ والدہ محترمہ نے اشارۃ کہہ دیا تھا کہ بیٹا یہ تمہارا تمہارے والد کا اس دار فانی میں آخری دیدار ہے، اور میں نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ نہ معلوم اس دار فانی میں ملاقات ہوگی بھی یا نہیں، جدا ہو کر، ایک کمرہ میں جاکر خوب رویا، پھر چہرہ دھو کر خدمتِ والا میں حاضر ہوا، اور السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ کے بعد خدا حافظ کہتا ہوا چلا آیا "خدا حافظ" جب میری زبان سے نکلا تو مسکرائے اور فرمایا "خدا حافظ"۔ آہ ! کہ عالم آب و گل میں یہ آخری رخصتی تھی۔

ممندہ سے میں حیدرآباد پہنچا، اور اسی دن لکھنؤ کے لئے روانہ ہو گیا، دارالعلوم ندوۃالعلما۔ تیسرے دن کوئی ظہر کے وقت پہنچا۔ ظہر بعد مسجد ندوہ میں تلاوت کلام پاک میں مشغول تھا، اور بار بار دعا کے لئے ہاتھ اٹھتے تھے کہ یکایک عصر کی اذان سے قبل ڈاکیہ تار لے کر آیا، جس میں وصال کی خبر تھی۔ نماز عصر کے بعد مسجد میں بیٹھا

خوب رویا، میرے رونے کو دیکھ کر کچھ طلباء نے حضرت مشفقی و محسنی استاذ مکرم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، کو مطلع کیا، حضرت مجھ پر بیحد مہربان تھے اور ہیں، وہ از راہ لطف و کرم مہمان خانہ سے مسجد تشریف لائے اور پوچھا "غوث" کیا بات ہے ؟ ضبط کر کے کہا کہ حضرت والد ماجد انتقال فرما گئے۔ سینے سے لگاتے ہوئے دلاسا دیا اور کہا : گھبراؤ نہیں میں تمہارا باپ ہوں، اور یہ تاریخ ۱۴/ جولائی ۱۹۶۲ء کی تھی۔

آہ ! کہ اس تباہ کار نے مرحوم و مغفور کی خاطر خواہ خدمت نہ کی، وہ مجھ سے خوش گئے، اکثر وہ مجھ کو منجھلے اور چھوٹے کہہ کر پکارتے، اور لوگوں میں میری تعلیمی جستجو کا اکثر اظہار فرماتے، ایک بار مجھ سے خود فرمایا کہ "بیٹے ! تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے"۔

یوں تو وہ مجسم خیر تھے، لیکن میں نے ان میں تین جوہر خاص پائے جو اوروں میں بہت کم دیکھنے میں آئے :

(۱) ایک صلح کل، جھگڑے پنچایت سے اجتناب، خود کوئی جھگڑا مقدمہ جائیداد وغیرہ کا کیا شروع کرتے ؟ ادھر سے کوئی اگر جھگڑا نکالتا تو اسے رفع ہی کراتے اور بات آگے نہ بڑھنے دیتے (حالانکہ پولیس ایکشن میں اکثر جائیداد پر ہندوؤں نے قبضہ جمالیا تھا اور نلگنڈہ کے مکان پر ایک ظالم قابض ہو گیا تھا جبکہ ہم بچے تھے، لیکن وہ چپ رہے اور ہمیشہ ابتلاء و مصائب میں زندگی بسر کی)۔

(۲) دوسرا یہ کہ اپنی اولاد سے بڑی محبت تھی، ابتلاء کے وقت روتے اور کہتے کہ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا سامان نہیں ہو پاتا، خدایا میری مدد کر۔

(۳) تیسرا یہ کہ ہمیشہ خوف خدا سے لرزتے، مغفرت کی دعا کے لئے ہمیشہ ذکر کرتے اور خاص طور پر اس گناہگار و سیاہ کار سے کہتے کہ بیٹا قرآن پڑھ کر بخشتے رہنا، اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر رحمت نازل فرمائے اور جنت الفردوس میں ان کو جگہ دے۔

(آمین) ۔ رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا ۔ ربنا اغفرلی ولوالدیّ وللمؤمنین یوم یقوم الحساب (آمین)

میرے والد ماجد کے تین بھائی تھے، ایک بڑے اور دو چھوٹے، کوئی بہن نہ تھی، بڑے بھائی میرے تایا کا نام مولوی حیات علی صاحب تھا، لکھے پڑھے آدمی تھے، مرنجان مرنج طبیعت رکھتے تھے، بچپن میں اکثر دیکھا کیا ان کی نو اولاد ہیں، آٹھ لڑکے اور ایک لڑکی، لڑکوں میں سے جن سے راہ و رسم تھی، وہ جناب غلام دستگیر صاحب، جناب غلام علی صاحب، جناب عبدالجبار صاحب، جناب عبدالغفار صاحب اور جناب محمد عباس صاحب، یہ سب مجھ سے عمر میں بڑے ہیں، اور ان بھائیوں میں بھائی محمد عباس صاحب سے بیحد خلوص و محبت قائم ہے، اور لڑکی کلثوم صاحبہ ہیں جو میری رضاعی بہن بھی تھیں۔

دوسرے (میرے چچا) مولوی بندہ علی صاحب تھے، میں نے انھیں نہیں دیکھا، ان کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں، اور ان میں سے بھائی عبدالخالق صاحب سے خلوص و محبت قائم ہے۔

تیسرے (چھوٹے چچا) مولوی امیر علی صاحب تھے، پولیس ایکشن سے قبل انھیں دیکھا تھا، چند ہی سال بعد انتقال فرمایا، پسماندگان میں انھوں نے ۳ لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی ۔ بچپن میں لڑکی بیابانی بہن کو دیکھا تھا۔ بھائیوں سے راہ و رسم نہ رہی۔

یاد رہے سلطنت آصفیہ کے زوال کے بعد ان میں سے اکثر احباب سے ربط و ضبط برقرار نہ رہ سکا، جب باشعور ہوئے تو ان میں کے بعض خدا کو پیارے ہو چکے تھے اور جو ہیں ان میں بھی بس چند ہی کو جانتا پہچانتا ہوں ۔ اس دوری کی وجہ ہماری زندگی کے اتار چڑھاؤ ہیں، پھر میری زندگی کا ابتدائی حصہ دارالاقامہ میں غربت کی حالت میں گزرا، پھر مدراس اور لکھنؤ میں تعلیم کے اسفار اور قیام کا سلسلہ رہا، پھر امریکہ کا مستقل قیام رہا۔ اللہ ہم سب کی کوتاہیوں کو معاف فرمائے۔

• • •

باب (۳)

والدہ ماجدہ

۱۹۱۳ء ۔ ۱۹۸۴ء

نام اُفضل بی تھا، اپنے والد مولوی سید غلام نبی صاحب مرحوم کی چار لڑکیوں اور دو لڑکوں میں دوسری اولاد تھیں، سن ولادت غالباً ۱۹۱۳ء تھا۔ پیدائش "اکنے پلی" ضلع نلگنڈہ میں ہوی، شادی کے وقت تک وہیں قیام اپنے والدین کے ساتھ رہا، پڑھی لکھی خاتون تھیں، اس زمانہ کی پانچویں جماعت پاس تھیں، اپنے وطن میں ایک تحتانوی اسکول تھا جس میں پانچویں جماعت تک تعلیم ہوتی تھی، وہیں وہ معلمہ ہو گئیں، اردو اور تلگو میں مہارت تھی۔ ہمارا ننہیال بڑا متمول تھا، ہمارے نانا صاحب ثروت و وجاہت تھے، اور اپنے قصبہ کے "مکھیا" تھے، اس پورے گاؤں میں وہ سب سے بڑے زمیندار تھے، انھوں نے اپنی اولاد کو اس وقت کی تعلیم دلوائی، لڑکیوں میں سب سے ممتاز میری والدہ ماجدہ تھیں۔

والدہ محترمہ، مزاج کی نیک، ہمدرد، غریب پرور تھیں، لیکن سب سے بڑی خوبی ان کی خودداری تھی، جس کی وجہ سے وہ پولیس ایکشن کے بعد بڑے آلام و مصائب میں مبتلا رہیں، مگر کبھی اپنے میکہ کا رخ نہیں کیا، ابتلا کا زمانہ نہایت تنگی و ترشی میں گزرا، اور جب وہ اس زمانہ کے ناداری کے واقعات ہمارے سامنے سناتیں تو ہم لوگوں کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے۔ بے چاری کو کیسا کیسا پتھ مار کر رہنا ہوتا تھا۔ اللہ ان کے اس صبر کا پھل قیامت میں بیٹھا دے۔

والد صاحب نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی سے ایک اولاد تھی جو ۱۹۶۴ء تک زندہ رہی، دوسری بیوی سے چھ لڑکے تھے، وہ اور ان کے سب

لڑکے وفات پائے، اور ہماری والدہ صاحبہ تیسری بیوی تھیں، اللہ نے ان کو ۸ بچے عطا کئے، چھ لڑکے اور ۲ لڑکیاں، پولیس ایکشن ۱۹۴۸ء تک والدہ ماجدہ نے خوش حال زندگی بسر فرمائی۔ پولیس ایکشن کے بعد ہم پر ایسی افتاد پڑی، اور ناداری کے وہ دن آئے کہ بس "الامان والحفیظ" مگر اپنی اولوالعزمی، وقار و خودداری نے قدم جمائے رکھا، سلطنت آصفیہ کے زوال کے بعد والد محترم کی کوئی کمائی نہ تھی، جب یہ ابتلاء ان پر آن پڑی تو ہم سب چھوٹے بچے تھے، اور جب ہم جوان ہوے تو ہماری کمائی اس وقت بہت کم تھی۔ یوں بھی شوہر کی کمائی اور اولاد کی کمائی میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ شوہر سے بیبیاں مچل کر، جھگڑ کر حاصل کر لیتی ہیں، بیٹوں سے کہتے ہوے مائیں خود لاج محسوس کرتی ہیں، خود ان کی مروت میں رعایت میں دبی ہوی پسی ہوی رہتی ہیں۔ یہ حقیقت شروع شروع میں سمجھ میں نہ آئی، جب اپنا اوھیڑ سن آیا، تب جا کے آنکھ کھلی۔

والدہ ماجدہ نے عمر طویل پائی، نماز روزوں کا اہتمام کرتی تھیں، جوانی کی خودداری نے بڑھاپے میں بھی انھیں اکثر اپنی اولاد سے دور رکھا، والد محترم کی جائیداد کو فروخت کر کے ایک مکان حیدرآباد میں بنالیا، جو ہماری بہن کے جوار میں تھا اور میرے مکان سے کچھ دور، بہوؤں میں میری اہلیہ بیحد پسند تھیں، دنوں ہمارے گھر رہتیں، اور دوسرے بیٹوں اور بہوؤں سے اس کا تذکرہ کرتیں، اور ہماری توقیر و عظمت ان کے دلوں پر بٹھاتیں۔ عام صحت آخر تک اچھی رہی، چلتی پھرتی رہتی تھیں، دبلی پتلی کشیدہ قامت جامہ زیب تھیں، سینکڑوں شعر اردو اور تلگو کے یاد تھے، اور مقولے و کہاوتیں تو گویا نوک زبان تھے، میری ترقی سے خوش ہوتیں اور اس پر فخر کرتیں، میرے امریکہ آجانے کے بعد غمگین رہا کرتیں، اور اکثر میرے ہی مکان میں قیام رہتا، میرے اور میری بیوی کی یاد میں محبت بھرے قصیدے گاتیں۔ میں امریکہ سے جب پہلی بار ملنے آیا تو مارے الفت کے لپٹ گئیں اور میری بیوی کو سینے سے لگایا

اور اپنی آپ بیتی سناتی رہیں، میں نے امریکہ ساتھ لے جانے کی تحریک کی تو راضی ہوئیں، پھر عین موقع پر انکار کیا کہ دیار غیر میں مرنا نہیں چاہتی۔

۱۵/ مئی ۱۹۸۴ء مطابق ۱۴/ شعبان ۱۴۰۵ھ کو تار سے سخت علالت کی اطلاع ملی میں نے اسی وقت ہندوستان کا قصد کیا، تیسرے دن حیدرآباد پہنچا، سخت بیمار تھیں، حیدرآباد میں اس وقت کرفیو تھا، تاہم پولیس کی اجازت سے نیلوفر اسپتال لے گیا اور وہاں تقریباً ۲۸ دن زیر علاج رہیں، پندرہ دن کے بعد کہا کہ بیٹا! میں اب ٹھیک ہوں تم امریکہ چلے جاؤ کیونکہ تم کو قرآن پاک تراویح میں سنانا ہے، میں جانے سے عذر کرتا رہا، ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ کوئی ایسا خطرہ نہیں، اللہ نے چاہا تو درست ہو جائیں گی۔ لیکن دل نہ مانتا تھا، دوسرے دن امریکہ کا ارادہ کیا، آخری بار جب میں شفاخانہ آیا تو باتیں کیں اور جب میں نے جانے کی اجازت طلب کی تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہا جان من آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ، اور ارشاد فرمایا کہ اس دار فانی میں ہماری آخری ملاقات ہے، اور اللہ نے چاہا تو جنت میں ملاقات ہوگی میں رونے لگا تو سمجھایا کہ مت روؤ، جمع خاطر رکھو، اور دعاؤں میں یاد رکھو، تو میں نے لجاجت اور الحاح و زاری سے اپنی خطاؤں اور نادانیوں کی معافی چاہی، تو انھوں نے از راہ الفت و محبت فرمایا کہ، میں نے تمہیں ہر طرح معاف کیا اور تمہارے لئے دعا گو ہوں، میں ان کے قدموں پر گر گیا، اور دل بھر کر رویا، وہ ہر بار دلاسا دیتیں اور دعائیں دیتیں۔ پھر میں نے آخری دیدار کرتے ہوئے دست بوسی کی، اور خدا حافظ کہہ کر جدا ہوا، وہ مجھ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہیں، اور آہستہ آہستہ "فی امان اللہ" کے الفاظ زبان مبارک سے کہتی جاتی تھیں۔

الحمدللہ، میرے والد محترم کی طرح میری والدہ بھی مجھ سے خوش تھیں، اللہ کا مجھ پر بڑا فضل رہا کہ بچپن سے ان دونوں کی خدمت جو مجھ سے بن پڑی کرتا رہا، حاشا و کلا یہ نہیں کہتا کہ حق ادا کیا، والدین کا حق ہم سے کیا ادا ہو سکتا ہے؟ جوانی کی

نادانیوں میں کبھی کبھی ادائے حق میں کوتاہی ہوجاتی تھی تو خدمت مادر میں آکر ناک رگڑتا تھا، وہ بخوشی معاف کرتی تھیں، غرض ان کو مجھ پر اور میری بیوی پر ناز تھا، روٹھتیں تو ہم سے، خفا ہوتیں تو ہم سے، شکوہ و شکایت ہوتا تو ہم سے، گلہ کرتیں تو ہم سے، اور ہم خوش تھے کہ وہ روٹھتی تھیں تو ہم مناتے تھے، خفا ہوتی تھیں تو ہم معافی چاہتے تھے، شکوہ و شکایت کا معاملہ ہوتا تو ہم اسے دور کرتے۔

والد محترم میری عین جوانی میں اللہ کو پیارے ہوئے، اس وقت میں ۲۳ سال کا تھا جب ہم مستقل طور پر کمانے لگے تو وہ ہم میں نہ رہے، ان کو اپنے ساتھ رکھ کر خدمت نہ کرنے کا قلق اب تک ہے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ میں علم دین کی تکمیل میں مصروف ہوں، والدہ محترمہ نے زمانے کی سمت ظریفی سے بڑے بڑے صدمے اٹھائے لیکن وہ عزم کا پہاڑ تھیں۔

غرض ۲/ رمضان ۱۴۰۵ھ کو والدہ مرحومہ کی اجازت سے امریکہ روانہ ہوا، مجھے حالات کا اندازہ ہو چکا تھا، تجہیز و تکفین کا سارا سامان اور تدفین کے تمام مراحل مکمل کر کے ہمارے ایک دوست و کرم فرما ڈاکٹر ممتاز علی خاں صاحب افضل کے حوالہ کیا، اور ہر دن کی اطلاع بذریعہ فون کرنے کی تاکید کی۔ ۱۰/ رمضان تک طبیعت ٹھیک تھی، ۱۱/ رمضان سے بگڑنے لگی۔ ۱۴/ رمضان کو میرے بھائیوں سے کہا کہ اب مجھے گھر لے چلو، میرا وقت موعود آچکا ہے، وہ گھر لے آئے، رات یاد الٰہی میں رو رو کر گزاری، ۱۵/ رمضان کی صبح عین نماز فجر کے وقت کہا کہ مجھے نہلاؤ اور صاف کپڑے پہناؤ، نہلا کر صاف کپڑے پہنائے گئے اور لا الہ الا اللہ کا ذکر زبان مبارک سے جاری ہو گیا۔

اور اسی کلمۂ توحید و رسالت پر جان، جان آفریں کے سپرد کی "انا للہ و انا الیہ راجعون" اسی دن تدفین کے بعد بذریعہ فون مجھے مطلع کیا گیا، بس کیا کہوں دل پر کیا گزری اس کو اللہ ہی جانتا ہے، زبان پر "انا للہ و انا الیہ راجعون" کے

کلمات آئے اور تین دن تک بس روتا ہی رہا اور تین دن تراویح میں محراب سنانے کے قابل نہ رہا۔

امی جان کی میرے اوپر شفقت کی انتہا نہ تھی، لڑکپن بھر، جوانی میں بلکہ صاحب اولاد ہونے کے بعد بھی میری ہر بد تمیزی کو وہ معاف کرتی تھیں اور ہر عذر کو قبول کرتی تھیں، غرض باپ کی طرح ماں بھی جس درجہ کی نعمت ہے (بلکہ باپ سے زیادہ) اس کا پورا اندازہ بھی اس نعمتِ عظمیٰ کی موجودگی میں شاید ممکن نہیں، بہرحال "من نہ کردم شما حذر بہ کنید" آج جو خوش قسمتی سے اپنے والدین رکھتے ہیں، اور اپنی بد نصیبی سے اس نعمت کی ناقدری اور بے توقیری کر رہے ہیں، شاید کہ ان سطروں سے کچھ سبق حاصل کرلیں اور قبل اس کے کہ وقت بالکل ہی ہاتھ سے نکل جائے کچھ تھوڑی بہت تلافی مافات کرلیں، ورنہ پچھتاوا ساری عمر کا رکھا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ والدہ ماجدہ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

حضرت والدہ ماجدہ کے دو بھائی اور تین بہنیں تھیں، ایک بھائی نے عین جوانی میں انتقال کیا، سب سے بڑی بہن کبریٰ بی تھیں، سوریا پیٹھ میں بیاہی گئیں اور ایک مدت ہوئی انتقال فرمایا، ان کو صرف ایک ہی بار دیکھ سکا، خلوص و محبت والی تھیں۔ ان کو دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں، چھوٹے لڑکے بھائی غیاث میاں مرحوم بڑی محبت والے تھے جو جوانی ہی میں انتقال فرما گئے۔

دوسرے نمبر پر عبدالرحیم صاحب تھے جو قاطع الرحم، مغرور، خود پسند اور متمرد آدمی تھے، اسی تکبر نے انھیں تربیت سے محروم رکھا، بے یار و مددگار انتقال کیا۔ ان پر ان کے اہل خاندان کی بد دعائیں تھیں، جو دنیا ہی میں قبول ہوئیں۔ ان کے کئی لڑکے اور لڑکیاں تھیں، اللہ تعالیٰ ماموں عبدالرحیم کی مغفرت فرمائے، اور ان کی خطاؤں کو معاف فرمائے۔ آمین۔

والدہ صاحبہ کی دو اور بہنیں تھیں جن کے نام و مقام سے میں واقف نہیں ہوں، نہ ہی کبھی ان کو دیکھا ہے اور نہ ہی ان کی کسی اولاد سے ربط ہے، ان کی اولاد میں سے ایک بیوہ لڑکی "کوداڑ" میں مقیم ہے، حسب مقدرت ان کی خدمت کی سعادت حاصل ہوتی رہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیوں کو معاف فرمائے۔ جب چھوٹے تھے تو ان کو نہیں دیکھا تھا جب بڑے ہوئے تو کسی نے ان کی اور ان کے متعلقین کی خبر نہ دی، اور طالب علمی و ازدواجی زندگی نے اس کی فرصت نہ دی کہ انھیں ڈھونڈ کر نکالیں۔ پھر ہجرتِ امریکہ نے تو پورا کام کر دکھایا۔

باب (۴)

بھائی بہن

بھائی بہن پیدا تو کل آٹھ ہوئے، ایک مجھ سے بڑے اور چھ مجھ سے چھوٹے، زندہ صرف پانچ رہے، ۴ بھائی اور ایک بہن۔ دو بھائی خواجہ نظام الدین و محمد نذیر الدین اور ایک بہن بدر النساء بیگم نے بچپن ہی میں انتقال کیا۔ ایک سوتیلے بھائی عبدالرشید بھی تھے، ذکر پہلے انھیں کا سنئے:

(۱) یہ مجھ سے کوئی ۲۰ سال بڑے تھے، تعلیم بس یونہی تھی، اس لئے جوانی میں محکمہ پولیس میں ملازم ہوئے اور ترقی کر کے جمعدار ہوگئے تھے۔ تین لڑکے اور چار لڑکیاں چھوڑیں، ۱۹۹۴ء میں انتقال فرمایا، خدا ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

(۲) بھائی جانی میاں صاحب یہ میرے حقیقی بھائی ہیں، اور مجھ سے سن میں ۲ سال بڑے ہیں۔ الحمدللہ بقید حیات ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔ تعلیم صرف تیسری جماعت تک پائی، بڑے ہوئے تو فوج میں ملازم ہوئے، کوئی بیس سال

کے بعد ریٹائر ہوئے، اس کے بعد مختلف محکموں میں ملازم رہے، اور آخر میں محکمہ پراویڈنٹ فنڈ سے وظیفہ پر علحدہ ہوگئے ہیں۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں، پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوی، دوسری سے ایک لڑکی ذکیہ بیگم ہے، اور وہ اب صاحب اولاد ہے، اور تیسری بیوی سے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے، تینوں لڑکیاں شادی شدہ ہیں، اور الحمدللہ صاحب اولاد، لڑکا سب سے چھوٹا ہے، جو نویں جماعت میں زیر تعلیم ہے۔ بھائی کا سن ولادت ۱۹۳۸ء ہے۔

نوٹ : دوسرا میں ہوں، میری زندگی کی تفصیل آگے ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) تیسرے بھائی خواجہ معین الدین ہیں، اور یہ ریلوے پولیس میں ملازم ہیں، اور اب ترقی کر کے جمعدار ہوگئے ہیں، غالباً سال دو سال میں وظیفہ پر علحدہ ہوجائیں گے۔ ان کے تین لڑکے ہیں، خدا ان کی عمر بھی دارز فرمائے یہ مجھ سے ۲ سال کے چھوٹے ہیں اور سن ولادت ۱۹۴۲ء ہے۔

(۴) خیرالنساء (بی جانی) یہ میری بہن ہیں۔ عمر میں کوئی چھ سال چھوٹی ہوں گی۔ سن ولادت ۱۹۴۶ء ہے، کثیرالعیال ہیں، اللہ نے ان کو ۱۲ اولاد عطا فرمائے جن میں سے اب چھ زندہ ہیں، دو لڑکے اور چار لڑکیاں، دونوں لڑکے عمر میں چھوٹے ہیں، تین لڑکیوں کی شادی ہوچکی ہے، اور ایک ساتویں جماعت میں زیر تعلیم ہے، اور دونوں لڑکے کلام اللہ حفظ کر رہے ہیں۔

ان کے شوہر افسر علی صاحب تاجر عطر ہیں، الحمدللہ نیک و صالح اور نماز کے حد درجہ پابند ہیں، خدا ان دونوں کو اور ان کی اولاد کو ترقی سے نوازے۔ آمین۔

(۵) عبدالقدیر، یہ سب سے چھوٹے بھائی ہیں مجھ سے کوئی ۸ سال چھوٹے ہوں گے، یہ بھی محکمۂ پولیس میں ملازم ہیں۔ ترقی کرتے ہوے اب سب انسپکٹر پولیس

ہوگئے ہیں، ان کی کوئی چھ اولاد ہیں، دو جاتی رہیں اور چار بقید حیات ہیں ۔ جن میں تین لڑکے ہیں اور ایک لڑکی، سن ولادت ۱۹۴۸ء ہے، اللہ ان کو اور مذکورہ سب بھائی بہن کو اور ان کی اولاد کو دارین کی سعادت و فلاح عطا فرمائے آمین۔

باب (۵)

دوسرے اعزہ و اقارب

میں نے اپنے اجداد میں سے بجز نانا صاحب کے کسی کا زمانہ نہیں پایا، دادی صاحبہ اور نانی صاحبہ نے جب انتقال فرمایا تو میں دو سال کا تھا اور دادا حضرت تو میری پیدائش کے قبل ہی انتقال فرماگئے۔ میرا سابقہ بڑے رشتوں میں صرف خلیرے ماموں حضرت الحاج عبدالرحیم صاحب مرحوم سے پڑا، یہ میرے حق میں شفقت مجسم تھے، یہ محکمۂ پولیس نلگنڈہ میں ملازم تھے، اور حکومت آصفیہ کے زوال کے بعد وظیفہ پر علحدہ ہوگئے تھے، نہایت خلیق، ذاکر و شاغل، اور میرے لئے تو بس سایہ رحمت تھے، ایک طویل عمر پائی ۱۹۸۸ء میں تقریباً ستر سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

ننھیال و ددھیال میں، والدین کے بعد جو کچھ تھے بس یہی تھے، میں نے ان کو ۱۲ سال کی عمر میں پہلی بار دیکھا، بڑے پیار سے ملے سینے سے لگایا، دعائیں دیں، میرے لئے یہ ایک عجوبہ سا تھا، کیونکہ حکومت آصفیہ کے زوال کے بعد ابا اور امی کے سارے دوست و اقرباء نے گویا ہم سے آنکھیں بند کر لیں تھیں، ہم نہ کسی چچا کو جانتے تھے نہ ماموں کو، اور نہ خالہ و پھوپھی کو، بس سنا کرتے کہ یہ ہمارے ماموں ہیں، اور وہ ہمارے خالو ہیں، اور خاندان کی ایک بڑی فہرست تھی لیکن ہماری ناداری نے ان سب کو ہم سے علحدہ کر دیا تھا، گویا وہ ہمارے سایہ سے ڈرتے تھے

حافظ بلا میں یار بھی اغیار بن گئے
قسمت بدل گئی تو زمانہ بدل گیا

• • •

والدین سے جدائی اور مدرسہ میں داخلہ

اللہ تعالیٰ اعلیٰ حضرت حضور نظام سابع کی تربت پر رحمتیں نازل فرمائے، ان کے والد آصف سادس مرحوم کا قائم کیا ہوا ایک مدرسہ تھا، جہاں غریب و نادار بچے پلتے تھے اور وہاں تعلیم و تربیت کا معقول انتظام تھا، والد محترم نے ۱۹۴۶ء میں اس مدرسہ وکٹوریہ میموریل سرور نگر میں ہم کو شریک کر دیا۔ بس اس کے بعد دو سال تک والد صاحب کا پتہ نہ چلا، معلوم ہوا کہ وہ پولیس ایکشن کے بعد والدہ محترمہ کے ساتھ ضلع نلگنڈہ چلے گئے، اور وہاں ملازمت کر کے زندگی گزارتے رہے۔ حضرت والدہ صاحبہ بڑی سلیقہ مند خاتون تھیں، وہ گھر میں چرخہ کات کات کر گھر کا خرچ چلاتی تھیں، ہم تینوں بھائی مدرسہ کی بورڈنگ میں تھے، چھوٹی بہن اور بھائی والدین کے ساتھ تھے۔ مسمدہ کی جائداد پر ہندو قابض تھے، اور وہاں کے گھر کی اینٹ تک وہ اکھاڑ لے گئے تھے۔

تقریباً دو سال بعد والد ماجد مدرسہ وکٹوریہ سرور نگر حیدرآباد، نلگنڈہ سے پیدل تقریباً ۶۴ میل کی مسافت طے کرتے ہوئے ہم سے ملنے کے لئے تشریف لائے، اور اپنی بے کسی و مجبوری اور اپنوں اور غیروں کی بے رخی کا ذکر کیا تو آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ لیکن والدہ محترمہ کی یاد ستاتی تھی، ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو والد ماجد نے فرمایا کہ بس کا کرایہ نہ ہونے سے وہ حیدرآباد نہیں آسکتیں، اور یہ کہ ان کے ساتھ تمہاری بہن اور بھائی ہیں۔ پھر کوئی ایک سال بعد ہمارے والد محترم چھوٹی بہن و بھائی کے ساتھ سرور نگر آئے اور ایک عالم دین کے گھر پر ٹھیرے، والد صاحب اور بہن و بھائی کو دیکھ کر ہم تڑپ اٹھے اور زار و قطار روئے، والد بھی ہمارے رونے سے بیتاب ہوگئے، اور اپنی مجبوری و ناداری کا ذکر کیا، غرض کہ یہ چند سطریں اس

درد بھری کہانی کا صرف ایک باب ہیں۔
تفصیل ان شاء اللہ مناسب موقع پر آتی رہے گی۔

جب اعزۂ واقرباء کا ذکر آ ہی گیا تو کچھ باتیں اور بھی سن لیں۔ حکومت آصفیہ کے زوال سے قبل ہی ہم حیدرآباد منتقل ہوگئے تھے اور والدین نلگنڈہ ہجرت کر گئے تھے، ہمارے نانا اور حقیقی ماموں صاحبِ حیثیت آدمی تھے، گو ہمارے والدین نے اس ابتلاء کے موقع پر ان سے کبھی بھی مدد طلب نہیں کی، ہمارا ننھیال اکنے پلی ہمارے آبائی وطن ممندہ سے ۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، ابتلاء کے بعد وہ سب ہی لوگ ضلع نلگنڈہ منتقل ہوگئے تھے، ہمارے والدین بھی نلگنڈہ چلے گئے تھے اور بڑی ناداری کی زندگی گزار رہے تھے، پھر بھی ہمارے نانا اور حقیقی ماموں کا کبھی کبھی راستہ سے گزر ہوتا تو وہ کنی کاٹ کر گزر جاتے، والد صاحب قبلہ نے ایک بار راستہ میں ہمارے ماموں (ان کے نسبتی برادر) کو دیکھ لیا اور سلام کیا (حالانکہ ہمارے والد عمر میں ان سے بڑے تھے) تو انھوں نے سلام کا جواب نہیں دیا اور اعراض کر گئے، تو وہ سامنے آئے اور پھر سلام کیا اور فرمایا کہ کیا تم مجھ کو نہیں جانتے، تو انھوں نے کہا میں آپ کو نہیں پہچانتا اور یہ بھی کہا کہ پھر کبھی میرے سامنے نہ آنا کہ تمہارے اس حال میں بہنوئی کہتے ہم کو شرم آتی ہے۔

دولت آتی ہے تو دشمن بھی فدا ہوتا ہے
مفلسی آتی ہے تو سایہ بھی جدا ہوتا ہے

والد محترم پھر زندگی بھر کبھی بھی ہمارے ماموں سے نہ ملے، اور والدہ ماجدہ کی غیور طبیعت نے کبھی بھی ان کے گھر کی گلی سے گزرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔

جب میں گیارہ سال کا تھا اور مدرسہ نظامیہ حیدرآباد میں کلام اللہ حفظ کر رہا تھا، ایک بار میری والدہ مجھ کو سوریاپیٹھ نلگنڈہ اپنی بڑی بہن کبریٰ خالہ کے پاس لے

گئیں، خالہ صاحبہ کو پہلی بار دیکھا، بڑی محبت سے پیش آئیں، اتفاق سے نانا صاحب ان کے پاس ان دنوں آئے ہوے تھے (اور اکثر ان کے پاس آتے جاتے تھے) میں نے شعوری آنکھوں سے پہلی بار ان کو دیکھا، بڑے ذی علم اور صاحب وجاہت آدمی تھے، ان سے یہ ملاقات پہلی اور آخری تھی، لیکن میں نے اپنے ماموں کو کبھی نہ دیکھا تھا، جب میں ۱۲ سال کا تھا اور حافظ قرآن ہو چکا تھا اس وقت اتفاق سے والدہ صاحبہ حیدرآباد تشریف لائی تھیں، کسی عزیز نے ان سے کہا کہ تمہارے والد صاحب کا انتقال ہوے کوئی ۳۷ دن ہوگئے ہیں، کیا تم کو نہیں معلوم، ہائے رے غربت! وہ یہ خبر سن کر خوب روئیں، اس عزیز نے یہ بھی کہا کہ ۳ دن بعد رامناپیٹھ ضلع نلگنڈہ یعنی ہمارے ماموں کے سسرال میں ختم قرآن رکھا گیا ہے جس کی والدہ صاحبہ کو اطلاع نہ تھی، غرض امی جان نے دوسرے دن میرے ساتھ نلگنڈہ کا سفر کیا، اور وہاں سے ہمارے خلیرے ماموں عبدالرحیم صاحب کے ساتھ عازم رامناپیٹھ ہوئیں، اور کسی دور کے عزیز کے پاس ٹھیریں، اور عین ختم قرآن کے موقع پر اپنے بھائی کے گھر گئیں، میں بھی ساتھ تھا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا، کسی بھی عزیز کو نہ جانتا تھا، ختم قرآن کے موقع پر ہمارے خلیرے ماموں صاحب نے مجھ سے سورۂ یٰس پڑھنے کی خواہش ظاہر کی، میں نے نہایت عمدہ تجوید وفن کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کی، ساری محفل نے اس تلاوت پر داد و تحسین کی، ایک کونے سے میزبان (یعنی ہمارے حقیقی ماموں) نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ بچہ کون ہے؟ ساری محفل میں سناٹا تھا، دوران تلاوت کچھ لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں ان کا نواسہ ہوں جن کی مغفرت کے لئے یہ محفل بلائی گئی تھی۔ میرے ماموں کی زبان سے جب یہ الفاظ نکلے کہ "یہ بچہ کون ہے" ساری محفل بے خود تھی اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، کسی نے اس سناٹے کو توڑا اور کہا میاں یہ تمہارا بھانجہ حافظ محمد غوث ہے جو تمہاری بہن افضل بی کا بیٹا ہے، عورتیں اس منظر سے بیتاب ہو گئیں اور بے تحاشہ رونے لگیں۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اسی طرح کا ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے میں اس درد بھری داستان کو ختم کرتا ہوں۔ اوپر کے واقعہ کے دو سال بعد میں حیدرآباد کی ایک سڑک پر سیکل پر سوار جارہا تھا، راستہ میں ہمارے اسی مہربان ماموں صاحب سے ملاقات ہو گئی، میں سیکل سے اتر آیا اور پہچان گیا کہ یہ میرے ماموں ہیں، میں نے سلام کیا تو انھوں نے بے اعتنائی کے ساتھ منہ پھیر لیا، تو میں نے کہا کہ آپ نے غالباً مجھے پہچانا نہیں، میں آپ کا بھانجہ حافظ غوث ہوں، کہنے لگے کہ کیا چاہتے ہو؟ کہا کچھ نہیں بس سلام و قدم بوسی کے لئے اتر آیا تھا، کہا ٹھیک ہے وہ تو تم نے کر لیا اب اپنا راستہ لو، میں اپنا منہ لٹکائے چلا گیا، راستہ بھر سوچتا رہا کہ پروردگار! اپنے قریبی عزیزوں تک میں ہم سے یہ بے رخی کیوں؟ حالانکہ ہم نے کبھی بھی ان سے کسی قسم کی مدد طلب نہ کی، اس وقت میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں، اب یہ سطریں لکھتا ہوں تو اپنا ہی ایک شعر یاد آتا ہے۔

حافظؔ بلا میں یار بھی اغیار بن گئے
قسمت بدل گئی تو زمانہ بدل گیا

اور اعزہ میں میرے ایک تایازاد بھائی محمد عباس صاحب ہیں، جو مجھ سے چار پانچ سال کے بڑے ہیں، میں جب حافظ قرآن ہو گیا تو ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا، وہ اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے بڑے کرم فرما، نہایت شفیق و مہربان، جب بھی ملتے پیار و محبت سے ملتے اور اب بھی ملتے ہیں تو شفقت ہی فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو تادیر سلامت رکھے اور ان عنایتوں کا صلہ دے (آمین)۔

• • •

باب (۶)

میری پیدائش

والدہ ماجدہ ممندہ سے اپنے میکہ (میرانخیال) اکنے پلی تشریف لائیں، کچھ دن یہاں قیام فرمایا تھا کہ میری ولادت یہیں ہوی، صبح کا وقت تھا اور ربیع الثانی کی گیارھویں تاریخ تھی، ہجری ۱۳۶۰ اور مطابق ۱۹۴۰ء غالباً ۲۵/ دسمبر کی تاریخ تھی۔

دستور تھا کہ ادھر بچہ پیدا ہوا، اور ادھر جلدی سے نہلا دھلا کر اذان اس کے کان میں دے دی گئی، جس طرح روح کو اس عالم میں روانگی کے وقت لوری کلمہ طیبہ کی دی جائے گی، اسی طرح اس عالم آب وگل میں آمد پر بھی اولیں لوری کلمہ پاک کی سنائی جائے۔ رضاعت والدہ ماجدہ کے پاس ہی رہی، اور انھیں سے سنا ہے کہ کبھی کبھی میری "تائی" نے بھی میری رضاعت کی جو ان دنوں ان کی لڑکی کلثوم (آپا) کی رضاعت کر رہی تھیں، والدہ ماجدہ نے محمد آغا نام رکھا، والدہ دو ماہ بعد ممندہ (اپنے سسرال) چلی آئیں، والد صاحب مرحوم کا کہنا ہے کہ چند دن کے بعد ایک بزرگ کا ممندہ سے گزر ہوا اور وہ ہمارے گھر مہمان ہوے، والد بزرگوار نے مجھ کو ان کی گود میں دے کر دعا کی درخواست کی، انھوں نے سعادت دارین کی دعا فرمائی، اور پوچھا کہ اس بچہ کا کیا نام رکھا تو والد صاحب نے فرمایا "محمد آغا" ارشاد ہوا کہ نہیں اس بچہ کا نام "محمد غوث" رکھئے، اور اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ یہ بچہ سعادتمند ہوگا، دینی و دنیوی ترقیات سے سرفراز ہوگا اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگا۔ امید ہے کہ یہ دعا ضرور قبول ہوی ہوگی۔

قصبہ ممندہ میں کوئی مدرسہ نہ تھا اور نہ ہی کوئی عالم و فاضل شخصیت تھی کہ کچھ لکھنا پڑھنا سیکھا جاسکے، ابا حضرت ہی نے گھر میں بسم اللہ پڑھادی۔

امی جان پڑھی لکھی خاتون تھیں، اور وہ شادی سے پہلے معلمہ بھی تھیں، انھوں

نے پڑھایا۔ پڑھانے میں ہمیشہ لاڈ و دلار نہیں چلتا، کبھی سختی و گرمی بھی ضروری ہے، جب وہ ڈراتیں تو میں رو دیتا تھا، اور وہ مارے محبت کے گود میں اٹھالیتیں، محبت سے ماں کا گود میں اٹھالینے کا فقرہ کیا ہی اثر انگیز ہے کہ آج سے ۵۱- ۵۲ سال قبل کے واقعہ کا اب زبان سے ادا ہونا کیا خوب ہے ! ہائے رے وہ ماں کے گود میں جانے کی لذت اب کیا بیان ہو ؟ وہ لذت جس کا بدل نہ کبھی جوانی کی گرمیاں دے سکیں، اور نہ کبھی بڑھاپے کی خنکیاں، غضب کی حسرت ناک سچائی بھردی ہے کسی نے اس مصرع میں

دو دن کو اے جوانی، دیدے ادھار بچپن

اس سن کی باتیں یاد کس کو رہ سکتی ہیں، بس کچھ باتیں یاد رہ گئی ہیں اسی کو یہاں قلم بند کر رہا ہوں :

اس قصبہ میں ایک بوڑھی نیک خاتون تھیں، وہ میری بڑی اماں کی بہن تھیں، ہم ان کو دادی ماں پکارتے تھے، وہ گھر میں اکثر چرخہ کاتتی تھیں اور پڑھی لکھی خاتون تھیں، والدہ محترمہ نے اب ان کے پاس پڑھنے کو بھیجا، وہ تھیں تو نرم مزاج، مگر پڑھانے میں سختی برتتی تھیں، انھوں نے عربی ناظرہ میں قاعدہ بغدادیہ پڑھایا اور اردو میں مکرم جاہ بہادر (آصف سابعؒ) کے پوتے کے لئے لکھا ہوا قاعدہ اردو۔ اور ان کے صاحبزادے مولوی عبدالرزاق صاحب مرحوم تلگو اور حساب سکھاتے رہے، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن چل نہ سکا اور گھر ہی پر والدہ ماجدہ کے پاس پڑھنا لکھنا ہوتا رہا۔

اسی زمانہ میں ہندوستان کی تقسیم کے مسئلہ نے سر اٹھایا، اور ہر طرف عالمی جنگ کا غوغا تھا، گو ہم کو یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ یہ جنگ کیا بلا ہے۔

والد محترم ہم کو ہزار سمجھاتے کہ جنگ یوں ہوتی ہے لیکن بات خاک پلے نہ پڑتی، اسی زمانہ میں مجھ پر موت و زیست کا ایک واقعہ پیش آیا، وہ یہ کہ امی حضرت نے

میری کسی نالائقی پر مجھے مارا، اس وقت میں چھ سال کا تھا، ان سے خفا ہو کر گاؤں کے تالاب کے کٹہ (باندھ) پر جا بیٹھا، بچے تیر رہے تھے، انھیں میں سے کسی شریر لڑکے نے مجھے تالاب میں ڈھکیل دیا، مجھے تیرنا نہ آتا تھا، غوطے کھانے لگا، دور سے ایک شریف آدمی گزر رہا تھا، اس نے ڈبکی ماری، بڑی مشکل سے مجھے اس موت کے پنجے سے نکالا، اور مجھے اٹھا کر گھر لایا، والدہ ماجدہ میری تلاش میں ضرور تھیں، لیکن انھیں یہ یقین نہ تھا کہ میں تالاب پر بھی جا سکتا ہوں، رونے لگیں، والد محترم اس وقت گھر پر نہ تھے، جب انھیں تفصیل معلوم ہوی تو ان کی پریشانی بڑھی، کیونکہ والدہ محترمہ "حنانہ" ہونے کے ساتھ ساتھ طبیعت میں تیزی اور غصہ رکھتی تھیں، اللہ ان کی مغفرت فرمائے، وہ مجھے میری نادانی پر چالیس سال کی عمر پر بھی مارتی تھیں۔ اور ان کو اس کا حق حاصل تھا۔

غرض اس طرح کی اور باتیں جمع ہوتی گئیں اور زمینداری کے جھگڑوں نے اب سر اٹھانا شروع کیا، میرے والد ماجد صلح پسند آدمی تھے، اور بیحد نرم مزاج، یہ صفت الحمدللہ، بہت اچھی ہے، لیکن یہی نرمی اور صلح کل کی پالیسی انھیں لے ڈوبی، ان کے حقوق پامال ہوے، والدہ بے چاری کیا کر سکتی تھیں، ہائیں ہائیں کہہ کر رہ گئیں، عمدہ جائیداد دوسرے بھائیوں کے قبضہ میں چلی گئی، ہندؤں کی ایک تقسیم "جسٹاپال" کے نام سے موسوم ہے کہ گھر کے بڑے بیٹے کو ایک مزید عمدہ حصہ زمین کا دیا جاتا ہے اس طرح یہ بری لعنت مسلمانوں میں بھی رائج ہو گئی، اور اس زمانہ میں یہ "جسٹاپال والا حصہ ہمارے "تایا" مولوی حیات علی صاحب کے حصہ میں آیا۔ والد ماجد اپنے بڑے بھائی کا بڑا لحاظ فرماتے تھے، اس لئے کچھ کہہ نہ سکتے تھے۔ اسی زمانہ میں حکومت ہند کو آزادی ملی اور حیدرآباد آزاد مسلم حکومت تھی، ہندوستان کی طرف سے حیدرآباد پر اب پولیس ایکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں، اور ہندو اب آہستہ آہستہ سر اٹھانے لگے

تھے ۔ والد محترم نے اس خطرہ کو بھانپ لیا ۔ حکومت آصفیہ کے زوال سے غالباً دو سال پہلے ہم تین بھائیوں کو لے کر نلگنڈہ گئے اور وہاں کے کلکٹر سے سفارشی خط لے کر حیدرآباد پہنچے اور مدرسہ وکٹوریہ میموریل سرور نگر میں ہم کو داخل کر دیا ۔ اس سفارش کے حصول میں حضرت ماموں عبدالخالق مسافر نلگنڈوی نے بڑی مدد فرمائی ، چار سال اس مدرسہ میں میں نے تعلیم پائی اور درجہ چہارم تک پڑھا ، الحمدللہ ہر کلاس میں امتیاز لاتا رہا کہ پوری کلاس میں سب سے اعلیٰ نمبر پر ہوا کرتا تھا ۔ اس امتیاز پر ایک بات یاد آئی اور اس کا خمیازہ اب تک بھگت رہا ہوں ۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ میرے بڑے بھائی جانی میاں میرے ہی ساتھ جماعت دوم میں پڑھ رہے تھے ، اور وہ پڑھنے میں تیز نہ تھے ، میں سالانہ امتحان میں دوسری جماعت میں سب سے اول رہا ، اور بھائی صاحب فیل ہوے ، اور رینک کے لحاظ سے ان کا ۲۶ واں نمبر تھا ، صدر مدرس عیسائی تھا ، بڑا سخت مزاج ، تعلیمی رتبہ میں شروع کے ۵ طالب علم بچوں کو چھوڑ کر سزا مقرر کرتا ، اور بید (لکڑی) سے پٹائی شروع کرتا ، بھائی چونکہ ۲۶ ویں نمبر پر تھے ، ان کی پٹائی جب شروع ہوی تو میرا امتیازی تعلیمی مقام مثالاً دہرایا جاتا کہ " دیکھ تیرا چھوٹا بھائی پوری جماعت میں اعلیٰ ہے اور تو کمبخت فیل ہوتا ہے اور کلاس میں آخری نمبر پر ہے " بار بار میری طرف اشارے نے اور ان کی بری طرح پٹائی نے بھائی کے لئے مجھ پر حسد کا کام کیا ، یہ گویا زخموں پر نمک کا چھڑکاو تھا ، مدرسہ کو چھٹی ہوی اور میں کھیل کود میں مصروف تھا کہ یکایک میرے کانوں میں " غوث " کی آواز آئی ، یہ آواز پہلے بھی آتی تھی لیکن اس میں پیار اور دلار ہوتا تھا ، اس بار آواز بدلی ہوی اور غصہ میں بھری ہوی تھی میں نے مڑکر دیکھا تو وہ میرے ماں جائے بڑے بھائی تھے ، انھوں نے کہا تو کلاس میں فرسٹ کیوں آیا ، تیری وجہ سے میری بری طرح پٹائی ہوی ، میں نے کہا بھائی جان ! اس میں میرا کیا قصور ہے ۔ بس اس پر وہ آپے سے باہر ہوگئے ، وہ نہایت قوی تھے ، میں بچپن سے صحتمند ضرور تھا مگر نازک مزاج ، انھوں نے مجھے اس بری طرح مارا کہ

میں بے ہوش ہو گیا، انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مجھے چت گرا کر ایک لات پوری قوت کے ساتھ میری سیدھی آنکھ پر ماری، اب ساری آنکھ خون سے شرابور تھی، مجھے فوراً شفاخانہ عثمانیہ حیدرآباد میں شریک کروادیا گیا، باقی زخم تو مندمل ہوگئے، لیکن آنکھ کی بینائی پر برا اثر پڑا، سیدھی آنکھ میں آب چشم کی مستقل بیماری شروع ہو گئی، لیکن الحمدللہ پڑھنے لکھنے میں یہ آنکھ دوسری آنکھ کی طرح ٹھیک تھی، لیکن ہر بڑی بیماری کے حملہ میں آنکھ متاثر ہوتی رہی، بالکل آخری بار جب میں تیس سال کا تھا اور "انفلوئنزا" کے مرض میں مبتلا ہوا تو سیدھی آنکھ پر لال پردہ آنے لگا، پھر وہ سفیدی میں تبدیل ہو گیا، اور اب وہ آنکھ پڑھنے لکھنے کے لائق نہ رہی۔ اللہ اللہ غصہ بھی کیا بری چیز ہے کہ آدمی اپنوں اور غیروں کی تمیز بھی کھو بیٹھتا ہے۔ اللہ میرے بھائی کو اس عمل پر معاف فرمائے۔

مدرسہ وکٹوریہ سرور نگر میں چوتھی جماعت سے زیادہ تعلیمی نظم نہ تھا، اس لئے مجھے مدرسہ کی (TECHNICAL BRANCH) یعنی فنی شعبہ میں ڈالدیا گیا، لیکن اس میں میرا قطعی جی نہ لگا، ہنر کیا سیکھتا بس بے ہنر ہی رہا۔ غرض مدرسہ وکٹوریہ میموریل کا یہ دور میری عمر کے ۶ سال سے دس سال کا زمانہ تھا، گویا پانچ سالہ دور۔

دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ مدرسہ میں اردو عربی پڑھنے کا انتظام بھی تھا، جس کے پڑھانے کے لئے قابل اساتذہ مقرر تھے۔ اردو کے لئے نامی گرامی استاذ مولوی محمد افضل صاحب تھے، جو نہایت خوش خط تھے اور ان کی تعلیم کا انداز نہایت نرالا تھا عربی کے لئے ایک مولوی صاحب مقرر تھے جن کا نام "منتقی مولوی صاحب" پڑ گیا تھا، وہ تعلیم الاسلام والی کتاب بہت ہی عمدہ پڑھاتے تھے۔

عربی قاعدہ یعنی بغدادی قاعدہ ہم نے منتقی مولوی صاحب کے علاوہ شروع شروع میں مولوی شبیر حسین صاحب جواں مرگ مرحوم سے پڑھا، وہ ایک صوفی اور پیدائشی ولی تھے، وہ اس مدرسہ کے سابق طالب علم اور اسی مدرسہ کے مامور ساتھی

بھائی الطاف حسین صاحب کے بڑے بھائی تھے ۔ایک اور پیلے شملہ والے مولوی صاحب تھے (جو اسی نام سے مشہور تھے)، وہ مدرسہ کی مسجد کے امام تھے ،انھوں نے نماز میں پڑھنے کی چھوٹی سورتیں یاد دلائیں ۔اور رہی ثنا، التحیات، درود ابراہیم اور دعائے قنوت، ناظرہ کلام پاک کی مشق تو اسے متقی مولوی صاحب نے کروائی ۔اللہ تعالیٰ ان سب بزرگوں کو اجر عظیم عطا فرمائے ۔آمین.

اس مدرسہ میں میں نے پڑھنے لکھنے کے علاوہ، جسمانی ورزش بھی سیکھی، جس میں مستقل پریڈ سکھلائی جاتی تھی، اور فٹبال، والی بال کا کھیل بھی یہیں سیکھا، اس کھیل کے استاذ ماسٹر اکرام الدین صاحب تھے، ان کے علاوہ ماسٹر نظام الدین خاں صاحب بھی ورزش کرواتے تھے۔

نماز کی پابندی اسی مدرسہ میں سیکھی، مولوی شبیر حسین صاحب مرحوم اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت اس میں خوب کام آئی، خصوصاً حضرت ابراہیم صاحبؒ کی تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، ان کی تربیت نے دل پر وہ نقوش جمائے کہ اب تک نہ مٹے، والدین اور اساتذہ کا ادب، اور ان کے ساتھ احسان و سلوک بھی انھیں سے سیکھا، اور اب تک "نقش کالحجر" ہے ۔اللہ سے ڈر اور خوف کا احساس بھی انھوں نے سکھایا، ان کی تربیت نے ہمارے دلوں پر وہ نقوش چھوڑے جو تاحال مرتسم ہیں ۔ رحمہ اللہ رحمۃ تامۃ ۔آمین.

غرض بچپن کی اس نادانی کو دیکھتا ہوں اور اب آس ادھیڑ عمر پر نظر دوڑاتا ہوں تو لگتا ہے کہ زندگی ہی کیا اور زندگی کی لذت ہی کیا ؟ یہاں کی ہر چیز فانی ہے۔

دنیا سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی

جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

یہ زندگی کیا ہے ؟ ایک آگ ہے جو کہ برابر بھڑکتی ہی رہتی ہے، سلگتی ہی چلی جاتی ہے ! اکبر نے بڑے تجربہ کی بات کہی ہے۔

کار جہاں کو دیکھ لیا میں نے غور سے
اک دل لگی ہے سعی میں، حاصل میں کچھ نہیں

اور دنیوی خواہشات اور لذتیں تو مستقل ایک عذاب ہیں۔
حضرت امجد حیدر آبادی نے کیا خوب کہا ہے :

لذتیں ختم ہو گئیں امجد
لذتوں کا عذاب باقی ہے

اور عمر ہے کہ انھیں لذتوں اور حسرتوں کی نذر ہوتی جارہی ہے اور اسی سعی لاحاصل کے پیچھے بسر ہوی جارہی ہے۔
بادشاہ ظفر نے عمر کی بے حاصلی کے مضمون کو خوب باندھا ہے۔

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو حسرتوں میں کٹ گئے دو انتظار میں

باب (۷)

حکومت آصفیہ کا زوال

(یعنی پولیس ایکشن)

۱۵/ اگسٹ ۱۹۴۷ء میں حکومت ہند کو آزادی ملی، اس وقت حکومت آصفیہ ایک آزاد مسلم حکومت تھی، لیکن حکومت ہند کی نظریں اس مالا مال حکومت پر مرتکز تھیں، آئے دن نئے نئے فتنوں کا آغاز ہوتا گیا، اور ہندوؤں کی شرارتیں بڑھنے لگیں، مسلمانوں میں ایک جماعت رضاکاروں کی تھی اور اس کے سربراہ قاسم رضوی تھے، جوش میں بھرے ہوئے انھوں نے رضاکاروں میں شعلہ بیانی سے آگ لگادی، کچھ رضاکاروں کے مظالم بھی ہندوؤں پر ٹوٹنے لگے، لوٹ مار، غارت گری، عصمت ریزی اور قتل کی وارداتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، جس کے نتائج حکومت آصفیہ کے زوال سے قبل اور بعد نہایت دردانگیز نکلے، لاکھوں مسلمانوں کی جانیں تلف ہوئیں، باعفت مسلمان لڑکیوں کی عصمت ریزی کی گئی، اور ہزاروں نے کنوؤں اور تالابوں میں ڈوب کر اپنی عفت بچائی اور جانیں دیں، خاندان کے خاندان لٹے، جائیدادیں برباد ہوئیں، ہندوؤں نے بات کا بتنگڑ بناکر شریفوں کو رذیل بنایا، غرض قیامت کا منظر تھا۔

میں اس وقت ۷، ۸ سال کا تھا اور اپنے دو بھائیوں کے ساتھ مدرسہ وکٹوریہ سرور نگر میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، مدرسہ کے اطراف تین چار سو کی فوج متعین تھی، اور اس مدرسہ کی حفاظت کر رہی تھی، کیونکہ یہ حضور نظام آصف سابع کے والد محبوب علی پاشا کا قائم کیا ہوا مدرسہ تھا، اور اس میں نادار اور غریب بچے تعلیم پا رہے تھے، اور اس کا خرچ اعلیٰحضرت خود اپنی طرف سے دیتے تھے۔

۲۳/ ستمبر ۱۹۴۸ء کی تاریخ تھی کہ ہندوستانی فوجیں دندناتی ہوی حیدرآباد میں داخل ہویں ۔شہر حیدرآباد میں تو فوری امن قائم ہوگیا، لیکن اضلاع و قصبات میں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا گیا، جائیدادیں لوٹ لی گئیں، لوگ گھر سے بے گھر کر دئے گئے، میرے والد ماجد، امی جان اور چھوٹے بھائی اور بہن کے ساتھ اپنے وطن مسمدہ ہی میں تھے کہ رات کے بارہ بجے کچھ مقامی ہندو آئے، اور ان کو بیدار کیا، اور کہا کہ آپ ہمارے بزرگ ہیں، آپ کی ذات سے ہم کو ہر طرح کا فائدہ پہنچا ہے، اس لئے آپ سے گزارش ہے کہ اس وقت مع اہل و عیال کے نکل جائیں اور اپنے ساتھ آپ جو کچھ لے جاسکیں لے جائیں، اور گھر خالی کر دیں، ہمیں ڈر ہے کہ کل کچھ نادان ہندو آپ پر حملہ کر کے قتل نہ کر دیں ۔والد ماجد اپنے اہل و عیال اور ضروری سامان کے ساتھ بیل گاڑی میں نلگنڈہ کے لئے روانہ ہوگئے، ان مقامی ہندوؤں نے حفاظت کے لئے بارہ نقیب ساتھ کر دئے تھے جو ان کو نلگنڈہ پہنچا آئے، نلگنڈہ میں اعزہ تو بہت تھے، مگر اس قیامت خیز ہنگام میں کون کس کو پوچھتا، وہیں کرایہ پر ایک مکان لیا اور زندگی بسر ہونے لگی، لیکن جو پونجی ساتھ لائے تھے وہ ختم ہونے لگی، اور ناداری و بے کسی کا بھیانک دور شروع ہوا، جو انھوں نے کبھی نہ دیکھا تھا، والدہ ماجدہ نہایت غیور و خوددار خاتون تھیں، وہ چرخہ کات کات کر اور گھر ہی میں مختلف سامان بنا بنا کر گھر کا خرچ پورا کرتی تھیں، ان کے والد (ہمارے نانا) اور بھائی (ہمارے ماموں) وہیں موجود تھے، لیکن کبھی بھی ان کے گھر قدم نہ رکھا اور نہ انھوں نے انھیں پوچھا، اور عزیز و اقارب اور یار دوستوں کا کبھی سامنا ہوتا تو وہ نظریں بچا کر نکل جاتے، یہاں تک کہ اپنوں نے ہمیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔

حافظ بلا میں یار بھی اغیار بن گئے
قسمت بدل گئی تو زمانہ بدل گیا

ہم بچے تھے، ہم کو صحیح حالات کا پتہ نہ تھا، جب کوئی ہم کو کبھی اس قیامت خیز حالات کی اطلاع دیتا تو زار و قطار روتے، اور والدین کی یاد تازہ ہوجاتی، اس درمیان ایک عزیز قریب مدرسہ آئے اور انھوں نے ممندہ اور اس کے نواح کی قیامت خیز داستان سنائی، اب کیا تھا، بے اختیار رونا دھونا شروع ہوا، اور خدا کی بارگاہ میں والدین کی حفاظت کی دعائیں مانگیں، پھر اسی عزیز نے والدین کے نلگنڈہ ہجرت کرنے، اور تمام جائیداد کے لٹ جانے اور ہمارے بیل بھینس بکریوں کو لوٹ لینے اور زمین پر ناجائز قبضہ کی اطلاع دی، اور یہ بھی بتایا کہ ہمارا دو منزلہ مکان، جس کو کوٹھی کہا جاتا تھا، توڑ دیا گیا، اور اس کے دروازے، کھڑکیاں لوٹ لی گئیں، غرض اناج، اور ہر وہ چیز جو والدین چھوڑ گئے تھے لٹ گئے۔ جان بچی سو لاکھوں پائے کے بمصداق والدین ماجدین بھائی بہن کے ساتھ صحیح سلامت تھے۔

غرض، ایک سال تک پتہ نہ چل سکا کہ والدین کہاں ہیں۔ ہم ان کی سلامتی کی دعا کرتے، تنہائی میں خوب زور و شور سے رو رو کر دل کا غبار نکالتے، جب مدرسہ میں دوسرے بچے ہماری آواز کو سنتے تو دوڑے دوڑے آتے اور پوچھتے : کاہے کی آواز ہے ؟ اور ہم باتوں میں بات ملا دیتے۔

پولیس ایکشن کے ایک سال بعد والد محترم چھوٹے بھائی اور بہن کو لے کر یکایک مدرسہ پہنچے، دیکھتے ہی دل مسرت سے باغ و بہار ہو گیا، اور مارے خوشی کے ہم رو پڑے۔ پھر حضرت نے جدائی کی دردانگیز داستان سنائی، وہ موجودہ حالت پر الحمدللہ خوش تھے۔ اور خدائے قدوس کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ انھوں نے ہمارے عزیزوں میں سے ایک ایک کا ذکر کیا کہ یہ یہاں شہید ہوے وہ وہاں مارے گئے، یہ وہاں سے نکل کر اب تک لاپتہ ہیں اور دیگر عزیزوں نے ہمارے ساتھ یہ یہ سلوک کیا وغیرہ۔

والدہ ماجدہ ان کے ساتھ نہیں آئی تھیں، ہم نے رو کر ان کے نہ لانے کا گلہ کیا،

تو فرمانے لگے کہ میرے پیارے بیٹو ! افلاس و ناداری کی وجہ سے میں ان کو نہ لاسکا، اور یہ بھی فرمایا کہ اس مدرسہ میں اب نادار بچوں کے علاوہ سینکڑوں یتیم بچے شریک ہورہے ہیں کہ جن کے والدین پولیس ایکشن میں مارے گئے، مجھے ڈر تھا کہ اگر ان کو لاتا تو تم کو مدرسہ سے خارج نہ کر دیا جاتا۔ اس کے علاوہ میں تمہاری چھوٹی بہن اور بھائی کو بھی ناداری کی وجہ سے مدرسہ میں شریک کرانے لایا ہوں۔ چنانچہ ان دونوں کو مدرسہ میں شریک کر دیا، کوئی ایک ماہ قریبی مسجد میں قیام فرمایا، اور روزانہ ملنے کے لئے تشریف لاتے رہے۔

وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں صاحب حیثیت ہوتا تو ہرگز تم کو یہاں شریک نہ کرتا، کیونکہ اس جگہ رہنے کے زیادہ مستحق یتیم بچے ہیں، اور جب انھوں نے اس دو سال کے عرصہ کی تعلیم اور ہماری علمی و جسمانی ترقی کو دیکھا تو بیحد خوش ہوے، اور دعائیں دیں۔ ایک ماہ بعد وہ ہم سے جدا ہوے، جدائی کا صدمہ بڑا دردانگیز تھا، اور ان سطروں کو لکھتے وقت بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہیں کہ جدا ہوتے وقت والد ماجد نے چند نصیحتیں فرمائیں اور خاطر جمع رکھنے کی تلقین فرمائی، اور امی جان کا سلام و پیار بار بار سنایا، اور ان کے نہ آنے کی مجبوری ظاہر فرمائی، اور فرمایا کہ ہماری سلامتی کی دعا کرتے رہنا کہ حالات اب بھی ٹھیک نہیں، کیونکہ میں اپنے وطن مسمدہ نہیں جاسکتا، وہاں کی جائیداد لٹ چکی ہے، اور سارے مویشی لوٹ لئے گئے ہیں اور گھر کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی ہے، اور وہاں اب ہمارے لئے کوئی ذریعۂ معاش نہ رہا، اور سب سے بڑا خطرہ ہماری جان کا ہے۔ اب ہم مستقر ضلع نلگنڈہ میں رہیں گے، اور خدا نے حالات درست فرمادئے تو میں جلد ہی تمہاری والدہ کو لے کر آؤں گا۔ ہم نے پوچھا کہ ابا جان آپ نلگنڈہ کس طرح جائیں گے، تو مسکراتے ہوے پیروں کی طرف اشارہ کیا۔ اب حضرت کا یہ سفر گرما کے موسم میں پا پیادہ سفر تھا، جو حیدرآباد سے

نلگنڈہ ہو رہا تھا ۔ اور جس کی مسافت تقریباً ۶۴ میل تھی ۔ غرض ہمارے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے ہم کو سینے سے لگایا اور خدا حافظ کہہ کر جدا ہوئے ۔

اس جدائی کے بعد ایک سال تک پھر والدین سے ملاقات نہ ہو سکی ۔ اس وقت ہم کو خط و کتابت کا سلیقہ نہ تھا، اور بعض خاص مجبوریوں کے باعث وہ ہم کو خط نہ لکھ سکتے تھے ۔ دن یوں ہی گزرتے رہے، شروع شروع میں والدین کی یاد میں ہم تڑپتے، دن رات روتے رہتے، پھر آہستہ آہستہ یہ یادیں مٹتی گئیں ۔ کوئی چند ماہ بعد ہمارے تایازاد بھائی مولوی غلام علی صاحب، جن کو ہم گورے بھائی کے نام سے یاد کرتے تھے، مدرسہ ملنے کے لئے تشریف لائے، غالباً وہ اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کے بعد ایک اعلیٰ درجہ کی نوکری پر مامور ہوگئے تھے، والد محترم کے بعد عزیزوں میں یہ وہ پہلے شخص تھے جو ان تین سالوں میں ہم سے ملنے تشریف لائے ۔ کچھ مٹھائی ساتھ لائے تھے، ایک گھنٹہ بیٹھے، تعلیمی حالات اور مدرسہ کے دیگر واقعات پوچھتے رہے، اور جاتے وقت ۴ آنے پیسے دے گئے، جو ہمارے لئے اس وقت ۴ روپے کے برابر تھے ۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس ہمدردی کا اجر عظیم عطا فرمائے ۔

غرض والد ماجد کی اس جدائی کے بعد ابا اور امی (دونوں) کوئی ایک سال بعد حیدرآباد تشریف لائے ۔ ابا جان کا امی جان کے ساتھ آنا گویا ہماری عید تھا، اس زمانہ میں حیدرآباد کے اضلاع سے اور زیادہ تر عثمان آباد ضلع سے تقریباً ایک ہزار یتیم بچے مدرسہ میں آکر شریک ہوئے ۔ اور ہم چار بھائی اور ایک بہن یہیں شریک مدرسہ تھے گو ہم یتیم نہ تھے ۔ تاہم ناداری اور افلاس ایسا تھا کہ ہم کو یہاں سے نکالا نہ جا سکتا تھا ۔ والدہ ماجدہ سرور نگر میں مقیم رہیں، اور والد صاحب قبلہ ملنے کے لئے تشریف لاتے، مدرسہ سے سرور نگر بس ایک میل پر تھا، ہم چوری چھپے ان سے مل آتے ۔ آپ کو یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کہ یہ چوری چھپے ملاقات کیوں ؟ لیجئے ہم بتائے دیتے ہیں،

مدرسہ وکٹوریہ میں حکومت کی طرف سے یہ (حکم) آچکا تھا کہ، اگر کسی بچہ کے والدین بقید حیات ہوں تو ان کو خارج کر دیا جائے۔ اس لئے والدین کو ڈر تھا کہ ان دونوں کے ایک ساتھ یہاں آنے سے معاملہ بگڑ جائے گا۔ اللہ اللہ ! والدین کو اپنے بچوں سے ہر حالت میں پیار اور حفاظت کی کیسی کیسی صورتیں سجھائی دیتی ہیں۔ غرض ایک ماہ بعد والدین نلگنڈہ واپس تشریف لے گئے۔ الحمدللہ اب حالات سدھر گئے تھے اور خوف و ہراس ختم ہو چکا تھا، تاہم جائیداد ساری کی ساری ظالموں کے قبضہ میں تھی۔

OOOOOOO

والدہ صاحبہ سے جدائی کے پانچ سال بعد ملنے کا جذباتی منظر

حضرت والدہ ماجدہ سے ۱۹۴۶ء کے اواخر میں جدا ہوا تھا، اور ۱۹۵۰ء کے وسط میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، والد ماجد سرور نگر میں ایک عالم دین (پیلے شملہ والے مولوی صاحب) کے پاس ٹھیرے، اور ہم سے ملنے مدرسہ تشریف لائے، والدہ صاحبہ کے مدرسہ نہ آنے کی مصلحت کا ذکر ہو چکا ہے، سب سے پہلے میں عشاء کی نماز کے بعد اندھیری رات میں والد صاحب کے ساتھ سرور نگر آیا، والدہ ماجدہ بے قراری کے ساتھ ہماری منتظر تھیں، چار پانچ سال پہلے جب ان سے چھ سال کی عمر میں جدا ہوا تھا، وہ دن تھا کہ آج کا دن، والدہ ماجدہ کا وہ گوشت سے بھرا چہرہ، وہ نہایت فربہ اندام جسم، آواز میں وقار، اور اب وہ دبلی پتلی، غم و اندوہ سے جیسے سکڑ گئی تھیں، آواز میں پستی و کمزوری، نہ معلوم مہینوں اور دنوں فاقہ میں گزارے ہوں گے، اور سب سے بڑھ کر اولاد کی جدائی ایسی تھی کہ گویا وہ انھیں کی یاد میں زندگی گزار رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر لپٹ گئیں اور زار و قطار رونے لگیں اور ہچکی بندھ گئی، والد صاحب نے بہت سمجھایا کہ صبر کرو، اللہ اچھے دن لائے گا، کچھ دیر

بعد خاموش رہیں، اور پیار سے باتیں کرنے لگیں، میری تعلیمی قابلیت پر وہ بہت خوش تھیں کہ میں ہر کلاس میں امتیاز لاتا تھا اور اسکول میں ہر ایک کا محبوب و مقبول، کہنے لگیں کہ بیٹے تم اب اچھے خاصے بڑے ہوگئے ہو۔ ان کو میری آنکھ کی بڑی فکر تھی۔ جو بھائی صاحب کی مہربانی سے متاثر ہو گئی تھی۔ رات تمام لطف و محبت کی باتیں کیں، اور میں تڑکے صبح سویرے فجر سے قبل مدرسہ پہنچ گیا، پھر بار بار مختلف بہانوں سے آتا جاتا رہا۔ ایک بہانہ خوب یاد ہے۔ ہمارے ایک ماسٹر کبھی کبھی سرور نگر سے اناج خرید لانے کو کہتے تھے، اب یہ حالت کہ بار بار میں ان سے پوچھتا کہ کیا آپ کو کوئی چیز سرور نگر سے خریدنی ہے، وہ بےچارے پریشان کہ اصرار کیوں ہو رہا ہے۔ غرض انسان غرض کا بندہ ہے، اور اپنے مقاصد پانے کے لئے بہانے نکال لیتا ہے۔ پھر دوسرے دن میرے بڑے بھائی ملنے گئے، پھر تیسرے دن میرے چھوٹے بھائی، لیکن چھوٹی بہن اور سب سے چھوٹے بھائی سرور نگر نہ جاسکتے تھے کہ وہ کم عمر بچوں میں تھے، البتہ ایک صورت یہ تھی کہ عصر بعد ان بچوں اور بچیوں کو باہر نگران کے ساتھ ہواخوری کروائی جاتی تھی، اور والدہ بھیس بدل بدل کر ان کو دیکھ آتی تھیں، لیکن دور سے دیکھنا اور بات ہے اور قریب سے ملنا اور۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے، اب ہم کو یہ اطلاع دی گئی کہ وہ باضابطہ روزانہ ملنے آئیں گی، لیکن خالہ بن کر، مدرسہ کے ذمہ داروں سے اس کی اجازت ملی، اور وہ اب خالہ بن کر آتیں اور دل کو راحت پہنچاتی تھیں، ہائے رے مجبوری کہ اب ہم سب کے سامنے اپنی ماں کو "ماں" نہ کہہ سکتے تھے، اور ہم سے خالہ پکارا نہ جاتا تھا، کسی نے پوچھا تو بس بے دلی سے کہہ دیا کہ یہ ہماری خالہ ہیں۔ غرض یہ تماشہ ایک ماہ تک ہوتا رہا، اور والدین کی سفر کی پونجی اب ختم ہوا چاہتی تھی، بادل ناخواستہ، دل پر پتھر رکھ آخری بار ملنے آئیں، اور سب جگر گوشوں کو سینے سے لگایا اور خوب روئیں، اور کہنے لگیں نہ معلوم پھر کب ملاقات ہو۔ ہم اس بار "ماں" کہہ کر سب کے سامنے رونے لگے، انھوں نے زور سے سب کے

سامنے کہا کہ میری بہن کے بچو ! خوش رہو، اللہ تمہیں دین و دنیا کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔

غرض، والدین پھر ایک بار ہم سے جدا ہوگئے، چند دن تک ان کی یادیں بہت ستاتی رہیں، پھر غم کے بادل چھٹتے گئے اور دل کے زخم بھرنے لگے۔ دل سے دعا نکلتی رہی کہ پروردگار ہم سب کو دوبارہ ملائیو ! **رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا** (آمین)

باب (۸)

فضل ربانی

گزشتہ اوراق میں، آپ نے ہمارے آباء و اجداد، بھائی بہن اور اعزہ و اقربا، کے واقعات ملاحظہ کیجئے، اور اس سیاہ کار کی پیدائش، ابتدائی تعلیم، مدرسہ و کٹوریہ میں داخلہ اور حکومت آصفیہ کے زوال کے واقعات پڑھے اور اس ضمن میں ہجرت حیدرآباد اور نلگنڈہ کے واقعات کو تفصیل سے ملاحظہ کیا کہ ہماری جائیدادیں کیسے لٹیں، خاندان کیسے منتشر ہوا اور احباب کیسے مارے گئے اور اپنوں اور غیروں نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ؟ اور والدین کی طویل جدائی، ان کی مجبوریاں، ابتلاء و مصائب کے چند پہلو آپ نے پڑھے اور سنے۔ اب ہم آپ کو وہ مژدۂ جانفزا سناتے ہیں، جو ہماری زندگی کا ابھرتا ہوا درخشاں باب ہے :

میرے ایک محسن و مربی استاذ تھے جن کا نام " محمد ابراہیم " تھا۔ حافظ قاری اور عالم دین تھے، بعد میں بڑے شیخ طریقت ہوئے، اور ہزاروں نفوس نے ان کی تربیت سے جلا پائی۔ ان کو ہم " بھائی جان " پکارتے تھے، عمر میں وہ مجھ سے کوئی ۱۵-۱۶ سال

بڑے تھے۔ حضرت محترم سابق میں اسی مدرسہ وکٹوریہ کے پلے اور بڑھے ہوئے تھے۔ وہ ہر ہفتہ مدرسہ کی مسجد میں تشریف لاتے اور قرآن پاک ناظرہ پڑھاتے، اور دین کی ضروری تعلیمات سکھلاتے، ان کی نظر عنایت مجھ پر اور الطاف حسین صاحب پر (جو بعد میں حافظ قاری مولانا شاہ الطاف حسین مدظلہ کہلائے اور جو اب مصحح دائرۃ المعارف و خطیب مسجد مردھے منور ہیں) پڑی انھوں نے ہم میں جو جوہر تھا اس کو پہچانا اور حفظ کلام اللہ کی تعلیم شروع کی، اور اسی مدرسہ میں دو پارے میں نے حفظ کئے۔ اور الطاف بھائی نے کچھ اور زیادہ، اور انھیں کی عنایتوں سے الطاف بھائی مجھ سے پہلے مدرسہ نظامیہ میں شریک ہوئے تھے۔

میرے یہی استاذ ایک دن یکایک مدرسہ آئے، ظہر کی نماز کا وقت تھا، نماز کے بعد مجھ کو علٰحدہ بلایا اور فرمایا کہ تمہارا داخلہ جامعہ نظامیہ حیدرآباد میں ہو گیا ہے اور عصر کے بعد یہاں سے نکلنا ہے۔

مدرسہ سے نکلنے کا مسئلہ نہایت اہم تھا، اور وہ والد محترم کی اجازت کے بغیر ممکن نہ تھا، والد صاحب میری تعلیم کی رکاوٹ سے بیحد پریشان تھے، لیکن ناداری کے سبب کچھ نہ کر سکتے تھے، میں نے مدرسہ نظامیہ میں داخلہ کی جو خبر سنی فوراً ہاں کہہ دی اور اب یہاں سے جانے کی ایک ہی صورت تھی، اور وہ بغیر اجازت بھاگ نکلنے کی، میرے پاس نہ کوئی کپڑے تھے اور نہ بستر، بعد نماز عصر چھپتے چھپاتے مدرسہ وکٹوریہ کو الوداعی سلام کہتے ہوئے نکلا، عجیب اتفاق کہ مدرسہ سے نکلتے ہی کوئی ایک فرلانگ پر حضرت والد صاحب ملے، وہ نلگنڈہ سے آرہے تھے، میں نے انھیں سلام کیا، جواب سلام کے بعد پوچھا کہ کہاں جارہے ہو، حضرتِ استاذ والا نے ساری تفصیل بتلائی، یہ خبر سن کر وہ خوش ہوئے اور اجازت دی۔ ہم ان کی دعاؤں کے ساتھ رخصت ہوئے۔

دوسرے دن جامعہ نظامیہ پہنچے، شیخ جامعہ مولانا عبدالحمید صاحب نے کہا کہ داخلہ کے کاغذات امیر جامعہ کے پاس گئے ہوے ہیں، ان کی دستخط کے بغیر داخلہ ممکن نہیں ۔ کیونکہ میرا داخلہ درمیانِ سال ہورہا تھا اس لئے یہ دقت پیش آئی ۔ داخلہ کی پوری کاروائی کے بغیر میرا جامعہ میں قیام ممکن نہ تھا، اس لئے کہ مسجد کے صحن میں پناہ ملی، حضرت استاذ محترم بیحد پریشان ہوے کہ یہ کیا ہوگیا، میں نے ان سے کہا کہ حضرت ہم ان مصائب وابتلاء کے عادی ہیں، خدا نے چاہا تو خیر کا راستہ نکل ہی آئے گا ۔

استاذ محترم مولانا محمد ابراہیم صاحب غریب آدمی تھے، ٹیوشن پر ان کی زندگی گزرتی تھی، وہ میرے طعام کا بندوبست نہیں کرسکتے تھے، اب فاقوں کا سلسلہ شروع ہوا، دن، دو دن میں ایک آدھ روٹی وہ خرید کر لاتے اور میں پانی میں بھگو کر کھالیتا ۔ مکہ مسجد میں حفظ کا مدرسہ تھا، جہاں دن میں تعلیم ہوتی تھی، دارالاقامہ نہ تھا، میں دن تمام قرآن یاد کرتا اور مدرسہ کے کسی استاذ کو سناتا، چند دن تک تو یہ سلسلہ چلا، جب مسلسل روزانہ مدرسہ جانے لگا تو استاذ نے کہا کہ داخلہ کے بغیر تمہاری تعلیم ممکن نہیں، داخلہ کے لئے اب سرپرست کی ضرورت تھی، اور میں اس وقت بے سہارا تھا، مگر حفظ کا سلسلہ جاری تھا، میں نے وہاں کے ایک استاذ کے ہاتھ پیر پکڑے اور التجا کی کہ میرا داخلہ جامعہ نظامیہ میں متوقع ہے، براہ کرم میرے قرآن پاک کے حفظ کا سبق اور آموختہ سن لیا کریں، وہ مجھ پر مہربان ہوے، پابندی سے سبق سنتے اور آئندہ کا سبق دیتے ۔ ایک بار پوچھا تم رہتے کہاں ہو ؟ میں نے کہا اس آسمان کے نیچے، تو کہا کیا مطلب ! میں نے کہا میرا کوئی گھر نہیں ۔ پوچھا والدین کہاں ہیں ؟ کہا نلگنڈہ میں، پھر پوچھا کہ کھاتے کیا ہو ۔ کہا میرے ایک استاذ ہیں، وہ ناداری کے سبب دن میں صرف ایک بار ایک آدھ روٹی خرید لاتے ہیں، اسی کو کھالیتا ہوں، اس واقعہ پر ان کی

آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے، اس کے بعد انھوں نے مجھے اپنے گھر لیجانا چاہا، لیکن میں نے اسے گوارا نہ کیا۔ اس درمیان والد صاحب قبلہ ڈھونڈتے ہوئے مکہ مسجد پہنچے، ان کو جامعہ نظامیہ کا پتہ معلوم نہ تھا، پوچھتے پاچھتے پہلے جب وہ وہاں جامعہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ میرا داخلہ متوقع ضرور ہے، لیکن ہوا نہیں ہے۔ پھر میرا پتہ اٹھاتے ہوئے یہاں پہنچے میرے پاس جسم پر صرف ایک کرتا اور ایک پاجامہ تھا اور دس دن سے انھیں دھو نہیں سکا تھا۔ ایک اس وجہ سے کہ دھونے کے لئے صابن میسر نہ تھا، دوسرے یہ کہ جسم سے کپڑے جدا کیسے کئے جاتے، والد صاحب کی آمد پر ان کے رومال سے لنگی کا کام لیا اور ایک آنے کا صابن خرید کر کپڑے دھویا۔ والد صاحب کے پاس پیسے زیادہ نہ تھے اور وہ مجھے اس حالت میں چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتے تھے۔

اور یہ وقفہ لمبا ہوتا جارہا تھا، چند دن میں نے اور والد صاحب نے مکہ مسجد کے قریب ہی میں مزدوری کی، اور یہ سلسلہ تعلیم کے ساتھ چلتا رہا۔ اب میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی، کسی صاحب نے مشورہ دیا کہ شیخ جامعہ روزانہ چوک کی مسجد میں عصر تا مغرب بیٹھتے ہیں، چلو ان سے مل لیں، جب میں وہاں پہنچا تو وہ جامعہ نظامیہ کے بعض شیوخ کے ساتھ گفتگو فرمارہے تھے، میں نے سلام کیا، انھوں نے پوچھا تم کون ہو، اور کس لئے آئے ہو؟ (حضرت موصوف طبیعت کے بڑے سخت اور کھرے تھے) میں نے مدعا ظاہر کیا، کہا کتنے پارے حفظ ہیں، (ایک ماہ قبل دو تھے اور اب پانچ ہوگئے تھے) میں نے کہا پانچ، بس امتحان لینا شروع کر دیا، میں نے اس امتحان میں ایک بھی غلطی نہیں کی وہ بیحد خوش ہوئے، کہا رہتے کہاں ہو، عرض کیا کہ کہیں بھی ٹھکانا نہیں، مسجد مسجد سونے کے لئے پھرتا ہوں، کہا کھانے کا کیا نظم ہے، کہا جب بھوک لگتی ہے تو مزدوری کرلیتا ہوں۔ کہا کیا تم وہی طالب علم ہو جو ایک ماہ قبل مولوی محمد ابراہیم کے ساتھ آئے تھے، میں نے کہا جی ہاں۔ کہا کل جامعہ آنا اور مجھ سے ملنا، دوسرے دن جامعہ گیا، تو از راہ عنایت دار الاقامہ میں داخلہ دلوادیا۔ اور اب

میں دلجمعی کے ساتھ حفظ کرنے لگا، الحمدللہ حفظ کی مدت تو صرف ڈیڑھ سال تھی، درمیان میں ۳ ماہ بیمار رہا، داخلہ ۱۹۵۲ء کے اواخر میں ہوا اور تکمیل حفظ ۱۹۵۴ء کے اواخر میں)۔

جامعہ نظامیہ کے بانی حضرت مولانا انوار اللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو آصف سادس اور آصف سابع کے استاذ تھے اور انھیں کی یاد میں اعلیٰ حضرت نظام سابع میر عثمان علی خان بہادر مرحوم، اس مدرسہ کی کفالت فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

حفظ کلام اللہ کے بعد میں قراءت و تجوید کے لئے دارالقراءات والدینیات الکلیمیہ نور خاں بازار میں شریک ہوا، جہاں قراءت سیدنا عاصم کوفی کی سند حاصل کی، میرے محترم استاذ حضرت ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی صاحب مرحوم پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے میری تعلیم پر خصوصی توجہ فرمائی۔ میں نے پھر قراءات سبع کی تکمیل کی۔ (یہ عرصہ کوئی ڈیڑھ سال کا ہے یعنی ۱۹۵۵ء کامل اور ۱۹۵۶ء کا نصف سال)۔

اب زندگی ٹیوشن پر گزرتی تھی، قیام ایک منہ بولی اماں کے پاس تھا، وہ میرا ہر طرح خیال فرماتی تھیں، اور یہ بھی حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب مرحوم کی عنایت تھی کہ وہ جب اپنے وطن "ادھونی" جانے لگے تو مجھے ان کے سپرد کر دیا۔ وہ ایک بیوہ بوڑھی خاتون تھیں، اور تنہا ایک کرایہ کے کمرہ میں رہتی تھیں، یہ بیچاری بڑی دکھی تھیں اور اپنے بیٹوں کے ظلم و ستم سے پریشان رہتی تھیں۔ جب (میں) منہ بولا بیٹا انھیں مل گیا تو وہ سارے غم بھول گئیں، میں ٹیوشن کرتا، کچھ رقم والدین کو بھیجتا اور کچھ میرے کھانے کا خرچ ان کو دیتا اور وہ ۸- ۱۰ روپیوں سے زیادہ نہ تھے، لیکن وہ میرا ہر طرح ناز اٹھاتیں، اور میں بھی ان کی ماں جیسی عزت کرتا۔ وہ میری ہر طرح خدمت کرتیں اور میں ان کی راحت کا سامان مہیا کرتا، اب گویا میں ان کا حقیقی

بیٹا تھا، اب میں ۱۴ سال کا ہو گیا تھا، اور میرا یہاں کوئی سرپرست نہ تھا، انگریزی تعلیم کا شوق اسی زمانے میں ہوا، چند ماہ میں میں نے "مڈل" (ساتویں) جماعت کا سرکاری امتحان امتیازی درجہ میں پاس کر لیا۔ مزید انگریزی، حساب، سائنس کی تعلیم مختلف اساتذہ سے حاصل کرتا رہا اور خانگی طور پر ایک مدرسہ سے نہم کا امتحان پاس کیا، پھر میٹرک کے امتحان میں مشغول ہو گیا، اب ٹیوشن کا انداز تھوڑا سا بدلا کہ اردو و عربی کسی کو میں پڑھاتا اور دوسروں سے میں انگریزی اور حساب پڑھتا۔ لیکن تعلیمی وسائل پوری طرح حاصل نہ تھے، کسی ٹیوٹوریل کالج میں داخلہ ضروری تھا اور وہ وسائل کی کمی کی وجہ سے پورا نہ کر سکا۔

۱۹۵۵ء میں، معاش کی تلاش میں سرگرداں پھرتا رہا، ایک جگہ مسجد مستان نمبولی اڈہ میں امامت و مدرسی پر تقرر ہوا، عمر ۱۵ سال تھی، بعض مصلیوں نے نماز پڑھنے سے انکار کر دیا کہ میں نابالغ ہوں۔ گو میں اونچا پورا تھا، ریش ابھی نکلی نہ تھی، اور آواز میٹھی ضرور تھی لیکن اس میں جوانی کی کرختگی نہ تھی، لیکن چند دنوں میں وہ میری قراءت پر لٹو ہو گئے، یہ سلسلۂ امامت کوئی ڈیڑھ سال تک ہی چل سکا، میری تنخواہ روزانہ ایک روپیہ تھی (یعنی ماہانہ تیس روپے)۔ آدھی تنخواہ میں والدین کو بھیجتا تھا، اس زمانے میں قیام مسجد کے ایک کمرہ میں تھا جس کی کوئی چھت نہ تھی، دھوپ، سردی اور بارش میں مسجد میں پناہ لیتا تھا۔

اسی زمانے میں مسلسل تین دن کا فاقہ پڑا، گرما کا زمانہ تھا، کسی سے کچھ کہتے شرم آتی تھی، میرے ایک دوست سے ۸ آنے قرض مانگا، اس نے دینے میں مزید ۱۲ گھنٹے دیر لگائی اور میں ایک مسلمان صاحب کی ہوٹل میں کھانا کھانے گیا، نہاری کلچے ہی اس رقم میں مل سکتے تھے، وہی منگوایا، برتن میں روٹی کے ٹکڑے ڈالا اور کھانے لگا،

کچھ ہی لمحوں کے بعد مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی، اور بے ہوش ہو کر گر پڑا، محلہ کے سارے ہی لوگ مجھے جانتے تھے بلکہ اکثر مصلی و مقتدی تھے، ہوٹل والے صاحب نے مجھے ایک کمرہ میں سلادیا، اور مجھ پر پانی چھڑکتے رہے، کچھ دیر میں مجھے ہوش آیا تو کہا صاحبزادے حافظ میاں ! تم کیوں گر پڑے ۔ میں نے کہا کہ میں تین دن سے شدید بیمار ہوں، اور شدید بخار ہے، انھوں نے کہا نہیں، تم بات کو چھپا رہے ہو، میں نے کہا نہیں، وہ اصرار کرنے لگے کہ صاف صاف بتلایئے، میں نے حقیقت حال سنائی، وہ رو پڑے، اور کہنے لگے کہ مجھ پر تف ہے کہ میں ہوٹل کا مالک ہو کر بھی کبھی آپ کے حالات نہ معلوم کر سکا، پھر قسم لی کہ کل سے میرے پاس کھانا ہوگا، میں نے انکار کیا، اور وہ اصرار کرتے رہے، میں نے قطعی انکار کیا تو کہنے لگے میرے بچوں کو پڑھادو، اور کھانے کا نظم میرے ذمہ ہوگا، میں نے کہا پڑھا ضرور دوں گا، اور اس کا کچھ "ہدیہ" آپ اپنی ہی خوشی سے مقرر کر دیجئے ۔ کہا "ہدیہ" بھی ملے گا اور طعام بھی، غرض میں نے ہدیہ تو قبول کیا، لیکن طعام قبول نہ کر سکا، یہ زمانہ بڑی معصومیت اور شرم و حیا کا زمانہ تھا۔

باب (۹)

میٹرک (دسویں جماعت) کی تیاری

اب میں یکسو ہو کر میٹریکولیشن کی تیاری میں مصروف ہو گیا، تیاری کے لئے ایک ٹیوٹوریل اسکول جاتا، اور وہیں طلباء کو اردو عربی پڑھاتا اور انگریزی حساب اور سائنس اور دیگر مضامین کی تیاری کرتا، یہی میری ٹیوشن کی فیس تھی (العلم بالعلم) الحمدللہ تیاری مکمل ہوی، امتحان کی فیس کے لئے پیسے نہ تھے، ادھار لئے (غالباً ۸ روپے فیس تھی) اور وہ جمع کروادی، لیکن ایک مرحلہ میری تاریخ پیدائش کی تصدیق کا تھا

اور وہ کسی سول سرجن ڈاکٹر سے کروانا تھا، اور اس کے لئے دس روپے درکار تھے جو میرے پاس نہ تھے، کسی نے مشورہ دیا کہ ڈاکٹر نظام الدین صاحب (بانی گاندھی میڈیکل کالج) کے پاس جاؤ، وہ حافظ قرآن بھی ہیں اور ڈاکٹر بھی، بغیر فیس کے کام چل جائے گا، دوسرے دن اس صداقت نامہ کو داخل کرنے کی آخری تاریخ تھی، میں صبح تڑکے فجر کی نماز کے بعد تین میل دوڑتا ہوا حیدر گوڑہ پہنچا جہاں ڈاکٹر صاحب رہتے تھے، ڈاکٹر صاحب اس وقت قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے، خوش ہو گیا کہ حافظِ قرآن آدمی ہیں اپنا کام تو بن جائے گا۔ گھر پر دستک دی، فرمایا کون، میں نے کہا حافظ و قاری محمد غوث، کہا آؤ اور بیٹھو، پوچھا کیسے آنا ہوا، میں نے اپنا مدعا ظاہر کیا، پوچھا قرآن پاک یاد ہے، میں نے کہا امتحان لے لیجئے، بس قرآن کھول کر کہا یہاں سے پڑھو اور وہاں سے پڑھو، میں نے لحن عربی میں نہایت عمدہ قرآن پڑھا، کہا بہت اچھا قرآن پڑھتے ہو، اب دل میں کہا صداقت نامہ تو مل ہی گیا، لیکن انھوں نے کہا دس روپے ساتھ لائے ہو۔ میں نے کہا میں غریب و نادار آدمی ہوں، میں آپ کی فیس اس وقت نہیں دے سکتا، بلکہ مہلت دیجئے، میں ماہانہ دو تین روپیوں کے حساب سے ادا کر دوں گا، کہنے لگے نہیں میں اپنے اصول نہیں توڑ سکتا۔ میں نے لجاجت سے کہا کہ یہ قرض ہوگا میں ضرور ادا کر دوں گا، وہ نہ مانے، میں سلام کر کے واپس چلا آیا۔ اور صداقت نامہ (تاریخ پیدائش) کی تصدیق داخل نہ کر سکا۔ اور امتحان میں نہ بیٹھ سکا۔ یہ ۱۹۵۶ء کا سال تھا۔

پہلا دورۂ مدراس

۱۳۷۵ھ کے رمضان المبارک شروع ہونے بس کوئی ایک ہفتہ باقی تھا، میرے ایک محسن دوست مولوی عباس علی مدراسی ان دنوں مدراس سے آئے ہوئے تھے۔ وہ

تاجر چرم تھے، میرے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔اور میری قراءت کے دلدادہ تھے، ان کا مدراس میں بڑا کاروبار تھا، فرمایا حافظ جی" کیا تم مدراس چلتا ہے "انھیں اردو بولنے کی مشق نہ تھی، میں نے کہا کس سلسلہ میں، فرمایا، قرآن پاک تراویح میں سنانا ہے، میں نے ہامی بھر دی، وہ مجھے لئے مدراس آئے اور وہاں کی "جامع مسجد" میں تراویح پڑھانے کا انتظام کر دیا، میری عمر کا سولھواں سال تھا، اللہ کے فضل و کرم سے قرآن خوب یاد تھا۔غرض عربی لحن بدل بدل کر جب میں قرآن سناتا تو لوگ جھوم جھوم سے جاتے، تراویح میں ایک ہزار سے زیادہ مصلی پابندی سے آتے رہے، سارے شہر میں دھوم مچ گئی کہ ایک نوجوان حافظ لڑکا آیا ہے۔اور تراویح میں غضب کی قراءت کرتا ہے، ۲۷ویں شب رمضان ختم قرآن تھا، اور میں تھا کہ دلہا بنا ہوا تھا، "ہدیہ" میں روپیوں کی بارش تھی، کوئی دو تین ہزار روپے گود میں تھے، ہر آدمی (اس قرآن کی برکت سے) آنکھوں پر بٹھاتا، دست بوسی کرتا اور اپنے گھر دعوت دینے کو سعادت سمجھتا، غرض، رمضان المبارک میں میں بغیر دلہن کے دلہا بنا رہا، دلہا بیچارہ تو ایک ہی گھر کا نور نظر ہوتا ہے، میں ہر گھر کا نور نظر تھا، روزانہ مختلف لوگ گھر پر دعوت کرتے، کاروں میں ساحل سمندر پر لے جاتے اور ضرورتوں کو پورا کرنے کی خواہش ظاہر کرتے۔مجھے خوشی کے ساتھ بڑی ہی شرمندگی ہوی کہ قرآن سنا کر کیوں میں نے پیسے قبول کئے، پھر خیال آیا کہ میں نے "ہدیہ" مقرر نہ کیا تھا، اور نہ ہی پیسے مانگے تھے۔میں نے ساری رقم والدین کی خدمت میں بھیج دی جس کے وہ اس وقت بیحد ضرورت مند تھے۔میں نے ایک خط میں ساری باتیں لکھ دیں تاکہ انھیں کسی قسم کا غیر ضروری شبہہ نہ ہو، والدین میری اس حقیر خدمت سے بیحد خوش ہوے اور دعائیں دیں۔

OOOOOOO

باب (۱۰)

۲۸/ رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ کو مقابلۂ قراءت

اور

"عمدۃ القراء" کا خطاب

"ان مع العسر یسرا" کی پہلی جھلک آپ نے مدراس میں تراویح اور تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر دیکھ لی۔ اور "ان مع العسر یسرا" کی دوسری جھلک دیکھیے: ۲۸/ رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ کو مدراس میں ایک عالی شان مقابلۂ قراءت مقرر ہوا جس میں وہ نامی گرامی حفاظ و قراء کرام شریک ہوئے جو تراویح سنانے کے لئے مختلف مقامات سے تشریف لائے تھے، جن میں حیدرآباد، دہلی، لکھنؤ، علی گڈھ اور مدراس کے حفاظ تھے، ایک بڑے ہال میں یہ جلسہ رکھا گیا، اور ہزاروں مسلمانوں نے اس میں شرکت کی۔ جلسہ کی صدارت حضرت پروفیسر مولانا سید عبدالوہاب صاحب بخاری مرحوم نے کی۔ ہر قاری کو مظاہرہ قراءت کے لئے دس منٹ دئے گئے تھے۔ پہلے مقامی قاریوں نے قرآن پاک کی تلاوت کی، پھر بیرونی قراء کی باری آئی۔ میرا نام درمیانی قراء میں پکارا گیا، یعنی ۲۸ قراء میں سے ۱۵واں نمبر۔ میں نے قراءت کلام کی تلاوت نہایت عمدہ لہجہ میں شروع کی، درمیان میں ایک آیت کو قرائت سبع میں پڑھا۔ داد و تحسین کی آوازیں بلند ہوئیں "سبحان اللہ، الحمدللہ، اللہ اکبر" وقت مقررہ پر قراءت ختم کرنی ضروری تھی، لیکن سامعین کا مطالبہ ہوا کہ قراءت جاری رکھی جائے۔ میں صدر محترم کی اجازت کا منتظر تھا، ان کا اشارہ پاکر اور مزید دس منٹ قراءت کی، اب کی بار رونے تڑپنے کی آوازیں آئیں، اور ایک صاحب تو قابو سے باہر ہوگئے اور بے ہوش ہوگئے۔ غرض جلسہ کے

اختتام پر انعامات کا اعلان ہوا اور الحمدللہ میں نمبر(۱) امتیازی رہا۔ انعامات میں کپڑے، رقم اور گھڑی کے ساتھ ساتھ سونے کا تمغہ ملا، اور اہل مدراس کی طرف سے "عمدۃ القراء" کا خطاب بھی، انعامات کے بعد دوبارہ قراءت کی فرمائش ہوی، میں نے سورۃ الرحمن کی تلاوت کی، تحسین و آفرین کی صدائیں پھر بلند ہویں۔ حضرت مولانا سید عبدالوہاب بخاری صاحب صدر جلسہ نے گلے سے لگایا اور کہا، بیٹے میں بھی حیدرآبادی ہوں۔ دوسرے دن میری حیدرآباد کو روانگی تھی، جو نہ ہو سکی، کیونکہ خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

جلسہ کے اختتام پر الحاج چودھری محمد برہان الدین صاحب میرے پاس آئے اور سینہ سے لگایا اور کہا کہ "میری خواہش ہے کہ آپ میرے ساتھ میرے غریب خانہ چلیں"۔ میں نے اس کو قبول کیا۔ گھر پہنچنے پر فرمایا کہ، آپ حیدرآباد میں کیا کرتے ہیں؟ میں نے کہا "ٹیوشن" اور امامت، اور زندگی کی تفصیل بتلائی، کہنے لگے کیا آپ میری مسجد کے مدرسہ میں امامت اور مدرسی کا کام کر سکتے ہیں؟ اور اس کے ساتھ وہ ساری تفصیل کہہ گئے کہ میں اس خدمت پر ایک سو پچیس روپیے دوں گا، آپ کا قیام و طعام میرے گھر پر ہوگا اور آپ میرے بچوں کو پڑھائیں گے جس کا علٰحدہ معاوضہ دیا جائے گا، اس کے علاوہ آپ کی دنیوی تعلیم کا نظم کر دیا جائے گا، جس کی پوری ذمہ داری مجھ پر ہوگی، وغیرہ وغیرہ، میں اللہ کی ان عنایات کو (جو صرف اس کے کلام کی برکت سے مل رہی تھیں) سن کر حیران و ششدر سا رہ گیا اور میں نے اس خدمت کی قبولیت کو باعث عزت و شرف سمجھا اور ہاں کہدی، اور والد محترم کو بذریعۂ تار مطلع کر دیا کہ اب یہاں اللہ کی عنایات کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ الحمدللہ، یہ بغیر مانگے نعمت میرے لئے اور میرے متعلقین کے لئے ہر طرح برکت کا باعث بنی

بن مانگے موتی ملتے ہیں
لیکن ایسا کم ہوتا ہے

میرا قیام مدراس میں دو سال رہا۔ پہلے سال ۱۹۵۷ء میں، میں نے اپنی دینی خدمات کو بخوبی انجام دیتے ہوئے (S.S.L.C.) میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ اور دوسرے سال ۱۹۵۸ء میں، میں نے انگریزی ادب کے مطالعہ اور انگریزی تحریر و تقریر کی تربیت حاصل کی۔

عالم دین بننے کا شوق شروع ہی سے تھا، لیکن حالات اس کی اجازت نہ دیتے تھے، رہ رہ کر آگے بڑھتا، لیکن پھر پیچھے ہٹنا پڑتا، ایک اہم سبب والدین کی مسلسل و مستقل مالی خدمت تھی، جو اچھی خاصی یہاں سے ہو رہی تھی، پھر دنیوی تعلیم کے سب ذرائع یہاں موجود تھے، اس محسن و مربی چودھری صاحب کو تو بس اشارہ چاہئے تھا، وہ بہت بڑے مالدار آدمی تھے، اور بڑے ہی فیاض، اس وقت سنا تھا کہ روزانہ ان کی کم از کم بیس پچیس ہزار کی آمدنی تھی، اور میں ان کی آنکھوں کا تارا تھا۔ ان کے علاوہ مدراس کے اکثر متمول احباب اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے بڑی بڑی ("OFFER") پیشکش کر رہے تھے، لیکن میں اس محسن کو کسی حال میں بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا، مولانا سید عبدالوہاب صاحب بخاری وظیفہ کے بعد اب نیو کالج کے پرنسپل ہوگئے تھے، اور وہ کالج میں داخلہ کی ترغیب دے رہے تھے، غرض، ہر طرح دنیا اپنی پیشکش کر رہی تھی، اور میرا اس ماحول سے نکلنا بیحد مشکل ہو گیا تھا۔ نہ معلوم کیوں یکایک انگریزی سیکھنے کا بھوت اترا، اور عربی ادب اور حدیث و تفسیر پڑھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ مدراس میں ایک نامی گرامی عالم دین تھے، مولانا عبدالعلیم نعمانی صاحب، بڑے علم و فضل کے مالک تھے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عربی پڑھانے کی درخواست کی، یہ درخواست کہنے سے پہلے قبول ہوی، انھوں نے فرمایا کہ کل سے روزانہ اس وقت آجانا، تقریباً ایک سال مسلسل ان سے محنت کے ساتھ پڑھتا رہا اور استاذ محترم مجھ سے بیحد خوش تھے اور ایک بار فرمایا کہ

میرے علم کا تم حاصل ہو، اور بڑی دعائیں دیں۔ اس مختصر مدت میں اچھی خاصی عربی لکھنے پڑھنے اور بولنے لگا تھا، کوئی یہ کہہ نہ سکتا تھا کہ میں کسی دینی مدرسہ کا طالب علم نہیں ہوں۔ (العظمة لله)۔

OOOOOOO

مدراس کے چیدہ چیدہ حالات

اب میری اٹھارہ سال کی عمر تھی، خوش حالی اور چودھری محمد برہان الدین صاحب کی بہترین غذاؤں نے مجھے فربہ اندام کر دیا تھا، اور میری دینی شہرت مدراس میں عام تھی، قراءت کا ہر بڑا جلسہ میری تلاوت سے شروع ہوتا تھا۔ یوتھ گروپ کے ہر مقابلہ میں خواہ وہ تحریری مقابلہ ہو یا تقریری، اکثر میں امتیاز لاتا تھا اور اب انگریزی عربی مقابلوں میں بھی خاصہ امتیاز پیدا ہو گیا تھا، اس شہرت کی بنا پر شادی کے پیغامات شروع ہو گئے، بڑے بڑے متمول گھرانوں کے رشتے آئے۔ میں ہاں کہتے کہتے رہ جاتا، ایک رشتہ شاہی خاندان کا آیا کہ ایک بہت بڑے متمول آدمی نے کہلا بھیجا کہ دہلی سے ایک صاحب تشریف لائے ہیں اور یہاں ان کا بڑا کاروبار ہے، وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں، دوسرے دن میں حیدرآبادی لباس، کرتا چوڑی دار پاجامہ شیروانی اور رومی ٹوپی پہنے ہوئے سج کر گیا، ادب سے سلام کیا، انھوں نے شفقت بھرے انداز میں بیٹھنے کے لئے کہا، حسب و نسب دریافت کیا، تعلیم کی تفصیل پوچھی، جب وہ ہر طرح مطمئن ہوئے تو دسترخوان بچھایا گیا، کھانے کے بعد فرمایا کہ آتے رہنا۔ اور دوسرے دن صبح ان کے ایک دوست کے ذریعے اپنی لڑکی کا پیغام بھیجا، ان کا شجرہ نسب جو اس پیغام میں منسلک تھا۔ غالباً چوتھی یا پانچویں پشت پر بادشاہ ظفر آخری فرمانروائے ہند پر ختم ہوتا تھا۔ میں حیران تھا کہ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے، تو میری مدد کر۔ لیکن میرے ضمیر نے کہا کہ نہیں ابھی نہیں، تم کو ابھی بہت کچھ بننا ہے، اور شادی کے بعد خصوصاً

متمول اور شاہی گھرانوں میں رشتہ کرنے سے، تمہارا ان سے نبھاؤ مشکل ہوگا، اور تم گھر داماد بن کر غلام بنے رہ جاؤ گے، اور گھر داماد کی خاندان میں عزت و توقیر نہیں ہوگی۔ غرض میں نے ان تمام خیالات کو یکلخت ٹھکرا دیا اور علم دین کی تحصیل میں لگ گیا۔

اسی زمانے میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدراس تشریف لائے، ان کی صورت دیکھ کر تو بس خدا یاد آگیا، اور جب ان کی تقریر سنی تو ان کا گرویدہ ہو گیا، لیکن وہ تین دن قیام کے بعد واپس دیوبند چلے گئے۔

چند ہفتے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کا سیاسی دورہ ہوا، اور نیو کالج میں ان کی عالمانہ تقریر سن کر جھوم جھوم سا گیا۔ اللہ اللہ کیا عبقری آدمی تھا۔

ایک ماہ بعد حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ رونق افروز ہوئے، اور اپنے مقالات سمعت پڑھ کر چلے گئے، وہ تقریر کے شہ سوار نہ تھے، لیکن کیا غضب کی تحریر تھی سبحان اللہ۔

اسی سال کے آخر میں استاذ محترم قاری عبدالباری مرحوم حیدرآبادی اپنی عام فہم تفسیر لے کر پہنچے۔ میں نے ان کی اس وقت بڑی خدمت کی، خوش ہو کر بولے، غوث تجھ کو خدا نے سب کچھ دیا ہے، کاش کہ تو عالم دین بھی ہوتا، یہ فقرہ دل میں بیٹھ گیا، اس کے بعد اس کے اسباب کے لئے دعائیں کرتا رہا۔ آخر خدا نے سن لی اور وہ مدعا حضرت الاستاذ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تھے۔

زندگی کی رفتار

ابھی کل کی بات تھی کہ ممنڈہ میں پلا بڑھا اور زندگی کے چھ سال گزارے، چھ سال کے اواخر میں مدرسہ وکٹوریہ میموریل سرور نگر حیدرآباد میں داخل ہوا، اس

اسکول میں ۴-۵ سال گزارے، گویا اب میں دس سال کا تھا کہ اس اسکول کو چھوڑا، لڑکپن یہیں کھویا، غرض کتنی بھولی بسری یادیں ان سطروں کی تحریر کے وقت تازہ ہو گئیں، کیسی کیسی حسرتیں، کیا کیا تمنائیں زندہ ہوا ٹھیں! اللہ اللہ کیا معصومیت تھی، کیسے بھولے پن، کس بے خبری کا زمانہ تھا! دنیا اس وقت کتنی معصومانہ تھی۔ غرض شوخیاں تھیں تو معصومانہ، شرارتیں تھیں تو طفلانہ، قلب میں کہاں تھی یہ قساوت اور کہاں تھی فسق کی یہ گہری چھاپ! کاغذ پر اب نقوش کو کوئی کیسے منتقل کر دے، وہ تو صرف تمامتر اعمال کے کاغذ پر فرشتوں ہی کے قلم سے ثبت ہیں۔ محبت اپنے وطن کی، الفت و کٹوریہ اسکول کی اور جامعہ نظامیہ کی اب رہ رہ کر یاد آتی ہے۔

بچپن اور اسکولی زندگی کا بیان ایک لمبے باب میں ختم ہو گیا، متفرقات سلسلہ میں ابھی بہت کچھ باقی ہے جو درمیان میں آتا رہے گا۔

---

۱۱ ویں سال میں جامعہ نظامیہ میں داخل ہوا، یہاں دینی ماحول تھا، ہر طرف سے قال اللہ اور قال الرسول کی آوازیں بلند تھیں، حفظ کلام پاک میں دو تین سال گزارے۔ جامعہ سے جب نکلا تو دو سال قراءات و تجوید میں قراءت عاصم و قراءات سبع کی تکمیل کی اور ساتھ ساتھ خانگی تعلیم بھی پاتا تھا۔ اب جوانی کا آغاز تھا سولھواں سال تھا، ۱۹ سال حیدرآباد میں گذارے پھر مدراس کی ٹھاٹھ باٹ کی زندگی گزری، عیش کے ہر طرح کے ساماں یہاں میسر تھے، ۲۹ سال کا عسر اب یسر میں بدل گیا، آہ قلم سے ابھی یہ کیا کیا نکل گیا، گزرے ہوئے ۲۹ سال، ..... سوچتا ہوں کہ یہ سن کبھی اپنا کیا رہا ہوگا، ہاں کبھی یہ خواب دیکھ لیا ہوگا۔ کاش اس خواب سے جاگنا ہی نصیب نہ ہوتا، کیسی بھولی یادیں تازہ ہو گئیں۔ آہ! کہ دنیا اس وقت کیسی رنگین کتنی پر لطف کتنی پر بہار اور کتنی دل فریب نظر آرہی تھی۔!

گزر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی۔

یہ شوخیاں و شرارتیں ۔اب کاغذ پر یہ سب نقوش کیسے منتقل ہوں ۔غرض وہ معصومانہ زندگی اور آغاز جوانی کی یہ حرارتیں، کیسے بھولی جاسکتی ہیں ؟ اس وقت یہ مصرع یاد آنے لگتا ہے ۔ ؎

دو دن کو اے جوانی دیدے ادھار بچپن

اور جوانی کا دور ختم ہونے کے بعد ، جوانی سے بھی اسی قسم کے خطاب کا جی چاہتا ہے ۔

OOOOOOO

باب (۱۱)

زندگی کا ایک نیا باب

(حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کی مدراس میں آمد ۱)

اب میری ابھرتی اور چلاتی جوانی تھی، عمر کا ۱۸واں سال تھا، علم دین کا شوق سر چڑھ کر بول رہا تھا۔اور انگریزی تعلیم کا بھوت اتر چکا تھا، شادی و خانہ آبادی کے ہر رشتہ سے انکار کر چکا تھا، اور اب ایک ایسے رہبر کی تلاش تھی جو مجھ کو انگلی پکڑ کر علم دین کی محفل میں لے جائے کہ ایسے میں حضرت الاستاذ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، فرشتۂ غیب بن کر مدراس میں قدم رنجہ فرما ہوئے ۔مدراس کے علمی حلقوں میں ان کی آمد کی شہرت تھی، میں نے ان کی دو کتابیں آمد کے قبل پڑھی تھیں ۔

(۱) مسلمانوں کے عروج و زوال کا انسانی دنیا پر اثر (۲) تاریخ دعوت و عزیمت ، کتابیں پڑھ کر غائبانہ میں ان کا مرید ہو گیا تھا، اور جب ان کی علمی و ادبی تقریریں سنیں جن میں سنجیدگی و متانت کے ساتھ ساتھ شعلہ بیانی بھی تھی، اور نیز جو بات حضرت کی زبان سے نکلتی تھی وہ دل کی گہرائیوں میں پہنچ جاتی تھی تو ان سے میری عقیدت اور

گہری ہو گئی ۔ مدراس میں موصوف کی ہر تقریر سے قبل میری تلاوت قرآن کا سلسلہ جاری تھا، غالباً ایک ہفتہ حضرت کا قیام رہا، میں ہر نشست و برخاست میں موجود رہتا۔

اس " تلاوتِ قرآن " کی وجہ سے میرا تعارف حضرت سے ہو چکا تھا ۔ ایک بار بعد نماز فجر حضرت کی خدمت میں پہنچا، بندگانہ شفقتوں سے نوازنے کے بعد فرمایا، میں نے سلام کے بعد ادباً گزارش کی کہ حضرت میں علم دین حاصل کرنا چاہتا ہوں، اور اس سلسلہ میں آپ کی رہبری چاہتا ہوں، حضرت نے زندگی کی تفصیل پوچھی کہ تم نے اب تک کیا کیا پڑھا ہے ۔ میں نے ساری تفصیل ۶ سال سے ۱۸ سال تک کی بتلائی، میری تفصیل سے وہ بڑے متاثر ہوئے ۔ اور فرمایا کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کا تعلیمی سال شوال سے شروع ہوگا، اور اب شعبان کی ۲۵ ویں تاریخ ہے ۔ تمہارے لئے ندوۃ العلماء بہترین جگہ ہوگی کہ تم اسی سال سے اور بجا خصوصی کلاس قائم کر رہے ہیں ۔ میں نے حضرت سے داخلہ کی اسی وقت درخواست کر دی، مولانا نے ایک کاغذ کے پرزے پر یہ تحریر لکھ دی :

حافظ قاری محمد غوث سلمہ کا درجہ خصوصی اول میں داخلہ منظور کیا جاتا ہے ۔ یکم شوال ۱۳۷۸ھ تاریخ اور حضرت کی دستخط تھی ۔ (مولانا اس وقت دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم تعلیم تھے) ۔ اور حضرت نے یہ بھی ہدایت فرمادی کہ اس کاغذ کو لے کر شوال کی ۱ تاریخ تک دار العلوم ندوۃ العلماء پہنچ جاؤ، اور ساتھ ہی ساتھ اپنے خادم سے فرمایا کہ ان کے داخلہ کی ساری کارروائی کر لینا، اور مجھے ندوہ پہنچ کر مطلع کرنا ۔

الحمد للہ رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ کی تراویح سے فراغت کے بعد، حیدر آباد پہنچا ۔ عید الفطر نلگنڈہ میں ہوئی، والدین کی اجازت و دعاؤں کے ساتھ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۴/ شوال المکرم کو پہنچ گیا، اور دوسرے دن داخلہ کی کارروائی

کار روائی بحمداللہ مکمل ہو گئی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

الحمدللہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ سے میری علمی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو گیا، میں نے ندوۃ العلماء میں تقریباً پانچ سال گزارے۔ تعلیم کا آغاز درجہ خصوصی اول سے شروع ہوا، یہ درجہ اسی سال ان طلباء کے لئے قائم ہوا تھا، جو کسی مدرسہ سے کم از کم میٹرک پاس کر چکے ہوں، اور خاص طور پر ضروری عربی پڑھ چکے ہوں، اور جن کی عمر ۱۶ سال سے متجاوز ہو، تاکہ وہ خصوصی توجہ سے عالم دین بن سکیں، خصوصی کے ۳ درجات مقرر تھے، ان تین درجوں میں ۶ سال کا نصاب پورا کیا جاتا تھا اور چوتھے سال "عالمیت" میں داخلہ دیا جاتا تھا۔ اور پانچویں سال میں سند دی جاتی تھی۔

الحمدللہ! میں نے درجہ خصوصی کے تینوں درجوں میں امتیاز حاصل کیا، اور عالمیت کے درجہ میں درجہ اول رہا۔ میری زندگی میں، میں نے جس محنت و جانفشانی سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی وہ ایک مثالی چیز تھی، غرض صبح و مسا، محنت ہی میں لگا رہتا، یہاں تک کہ ایک بار حضرت الاستاذ علی میاں مدظلہ کو تاکیداً بھلانا پڑا کہ اس طرح محنت نہ کیا کرو، بلکہ کچھ دیر آرام اور کھیل میں بھی وقت گزارو۔ اس وقت ندوہ کا ایک لطیفہ یاد آیا کہ ندوہ میں کچھ یوپی و بہار کے نامی گرامی طلبہ تھے، ایک دن ان میں کے چند ممتاز طلبہ نے مجھ کو چائے پر بلایا، اور میرے خاندان کے متعلق پوچھنے لگے کہ آپ کے والد ماجد کہاں کے ہیں، میں نے کہا حیدرآباد کے پوچھا دادا کہاں کے تھے، تو میں نے کہا حیدرآباد کے! کہنے لگے کہ پردادا ضرور یوپی کے ہوں گے؟ تو میں نے کہا کہ نہیں وہ بھی حیدرآباد ہی کے تھے۔ ہاں میں نے سنا ہے کہ ہمارے جد اعلیٰ بغداد سے دہلی آئے تھے اور وہ اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کے ایا لیق

میں تھے پھر وہ ان کے ساتھ حیدرآباد چلے گئے اور قاضی بنے۔ تو وہ کہنے لگے ہاں! تب ہی تو آپ میں یہ بات ہے کہ آپ ندوہ کی ہر جماعت میں امتیاز لاتے ہیں، ورنہ حیدرآبادی میں یہ بات کہاں ہو سکتی ہے؟ اللہ اللہ کیا طالب علمی کا زمانہ تھا اور کیا غیر ضروری تعلی تھی۔

غرض ندوہ کے صبح شام کچھ اس طرح گزرتے تھے کہ عشاء کی نماز کے بعد اکیلا ندوہ کی مسجد میں سو رہتا، ٹھیک بارہ بجے اٹھ جاتا اور فجر تک حصول علم میں مشغول رہتا، بعد فجر تلاوت قرآن کے بعد پھر پڑھنے میں مشغول رہتا، ناشتہ کے بعد مدرسہ جاتا، ظہر تک مدرسہ میں پڑھتا۔ ظہر کے بعد گرما کے موسم میں چھٹی رہتی۔ کچھ دیر سو رہتا پھر غیر درسی کتابوں کے مطالعہ میں لگ جاتا، عصر بعد اکثر حضرت علی میاں مدظلہ کی صحبت میں بیٹھتا، جہاں بڑے درجہ کے طلباء و معلمین ان سے سوالات کرتے اور اپنی علمی پیاس بجھاتے اور علمی جوابات پاتے، اور کبھی کبھی حضرت الاستاذ مولانا محمد اویس نگرامی ندوی کی مجلس سے فائدہ اٹھاتا، ان دونوں بزرگوں سے میں نے سب سے زیادہ علمی فائدہ اٹھایا، ان کے علاوہ حضرت الاستاذ مولانا اسحاق صاحب ندوی سے فائدہ اٹھاتا رہا، یہ بھی بڑے علم و فضل کے مالک تھے اردو، عربی، فارسی، انگریزی میں کمال رکھتے تھے، درسیات میں ہر مضمون کے پڑھانے میں درک رکھتے تھے۔ ادبی کتابیں حضرت الاستاذ مولانا وجیہ الدین صاحب ندوی مرحوم، مولانا سعید الاعظمی صاحب ندوی اور مولانا محمد رابع صاحب ندوی سے پڑھیں۔ فقہ میں مولانا محمد ظہور صاحب ندوی سے استفادہ کیا جو دار العلوم کے مفتی ہیں۔ صرف و نحو مولانا حبیب الرحمن صاحب اور مولانا سعید الرحمن صاحب ندوی سے پڑھیں۔ حدیث حضرت مولانا منظور نعمانی مدظلہ سے، تفسیر حضرت مولانا محمد اویس نگرامی ندوی سے، منتخب ادبی شہ پارے اور بخاری شریف کے بعض ابواب حضرت الاستاذ مولانا علی میاں مدظلہ سے پڑھے جو میرے شیخ طریقت بھی ہیں۔ ان بزرگوں کے علاوہ دیگر اساتذہ سے

بھی استفادہ کیا، ساتھیوں میں مولانا احمد لاٹ صاحب سورتی سے اکثر علمی مذاکرے کرتا اور کم عمر طلبا۔ میں مولوی شفیق احمد ندوی سے علمی باتیں ہوئیں۔ مولوی شفیق سلمہ عجیب و غریب صلاحیت کے طالب علم تھے اور اب تو وہ ڈاکٹر ہوگئے ہیں اور جامعہ ملیہ میں ریڈر ہیں اور مولانا احمد لاٹ ندوہ تبلیغی مرکز کے اہم ذمہ داروں میں ہیں۔ "عالمیت" کے سال میں میرے ساتھی و ہم سبق مولانا سید محمد غفران ندوی صاحب سے بھی میں نے استفادہ کیا، اور درس کے دوران ان کے لکھے ہوئے بعض "نکات" بے حد کام آئے۔ موصوف اب دار العلوم میں مجلس نشر و اشاعت کے ذمہ دار ہیں۔

دار العلوم کے اس تعلیمی دور میں میرے مرشد و مربی علامہ سید ابو الحسن علی ندوی دامت برکاتہ کی سرپرستی ہمیشہ حاصل رہی۔ مدراس چھوڑنے کے بعد معاشی دروازے بالکل بند ہوگئے تھے۔ حضرت نے ہر طرح کی علمی و مالی اعانت فرمائی۔ اور ان پانچ سالہ زندگی میں وہ میرے روحانی باپ تھے اور اب تو وہ میرے پیر و مرشد ہیں، لکھنؤ کا موسم میرے لئے صبر آزما تھا، یہاں کا ہر موسم شدید تھا، زیادہ محنت کی وجہ سے اور کھانے پینے اور رہنے سہنے کے انداز بدلنے سے بیمار ہو جایا کرتا تھا، حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب ندوی عالم دین کے ساتھ حکیم و طبیب بھی تھے وہ اکثر میرا خیال رکھتے، ایک بار شدید بیمار پڑا، میرے مرشد و مربی مولانا علی میاں ندوی مدظلہ از راہ لطف و کرم میری عیادت کے لئے میرے کمرہ میں تشریف لائے، اور دلاسا دیا، دوسرے دن اپنے ایک سفارشی خط کے ساتھ، اس زمانہ کے ایک مشہور لکھنوی طبیب کے پاس بھیجا، انھوں نے میرا بڑا خیال رکھا۔ اور بڑی توجہ سے میرا علاج کیا۔

غرض دار العلوم ندوۃ العلماء میرے لئے ایک دوسرا وطن تھا، وہاں کے اساتذہ میرے ہمدرد، طلباء و ساتھی میرے بھائی اور حضرت مولانا علی میاں مدظلہ میرے والد جیسے تھے بلکہ حضرت والد ماجد کے انتقال کے بعد ان کی توجہات اور بڑھ گئی تھیں اور

والد ماجد کی تعزیت کے موقع پر فرمایا تھا "آج سے میں تمہارا باپ ہوں"۔ ندوہ میں ہر علمی و ذاتی مشورہ حضرت سے کرتا، کبھی کبھی رائے بریلی جاکر وہاں کی بہار روحانی کیفیتوں سے تسکین پاتا۔ طالب علمی کے زمانہ میں حضرت کی خدمت کی سعادت بھی اکثر مجھے حاصل تھی، اور میرے لئے ان کے "دربار" میں آنے جانے سے کوئی رکاوٹ نہ تھی، بلکہ بعض وقت مہمان خانہ ندوہ کا میں خدمت کے بعد قیلولہ کرتا تھا۔

غرض ندوہ میری مادر علمی ہے، حفظ کلام اللہ اور قرأت سبع کے حصول کے بعد جو کچھ سیکھا وہیں سے سیکھا، اور جو کچھ دینی و دنیوی اعزازات حاصل ہوئے فضل خداوندی کے بعد وہ ندوۃ العلماء اور وہاں کے شفیق اساتذہ کی علمی توجہ و تعلیم و تربیت سے حاصل ہوئے۔ اور اپنی زندگی سے اب تک میرے مرشد و مربی حضرت علی میاں ندوی مدظلہ کی رہنمائی و سرپرستی حاصل ہے، میری تحریری و تقریری صلاحیتیں، میری تصانیف اور تالیفات، میری دینی و دنیوی ترقیاں سب کی سب علماء ندوۃ العلماء کی رہین منت ہیں، اور آج بھی علمی مشکلات میں اسی ندوہ کی طرف رجوع کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ندوۃ العلماء کے بانیوں اور اساتذہ کرام کو اپنی شان کے مطابق اجر عظیم عطا فرمائے آمین۔

ارے! ندوہ کے ان خدام کو تو میں بھول ہی گیا تھا، جو کتب خانہ میں کتابیں فراہم کرتے، مطبخ میں کھانے پکاتے اور حجرے میں کھانا پہنچاتے تھے، ندوہ کی صفائی اور خبر گیری کرتے تھے۔ ہر ایک کے نام تو یاد نہیں۔ لیکن کتب خانہ کے ایک خادم مولوی عبداللہ سے بڑی راہ و رسم ہو گئی تھی، ان کو اس کتب خانہ کی صحبت نے عالم بنا دیا تھا اور حضرت استاذ مولانا مرتضیٰ صاحب مرحوم ناظر کتب خانہ کا نام رہ جاتا ہے یہ زیادتی ہوگی کہ ان کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ وہ مجھ سے مشفق و مہربان تھے، کوئی علمی بات سمجھ میں نہ آتی تو فرماتے کتاب دیکھ لو اور میں اکثر مکتبہ کے [illegible] خصوصی دلچسپی لیتے، وہ کبھی کبھی ہم کو پڑھاتے بھی تھے، ان کا ایک جملہ یاد ہے جو

ہم کوئی علمی سوال کرتے کہ یہ فعل اور اس کا مادہ ایسا کیوں ہے تو فوراً سہل زبان میں سمجھا دیتے۔

ان کے چھوٹے بھائی میرے کرم فرما حضرت الاستاذ مولانا ڈاکٹر محمد اسحاق ندوی مدظلہ سے میں نے عربی ادب کا ذوق پایا۔ وہ بڑے فصیح و بلیغ ادیب ہیں۔ ندوۃ العلماء کے درجہ عالمیت میں ایک مقالہ لکھنا ضروری تھا، اور اس کے بغیر سند نہیں ملتی تھی، جب میں "غزوات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ضوء القرآن والأحادیث" لکھ رہا تھا، تو میں نے ان کی خدمت میں جاکر اس مقالہ کی سرپرستی و نگرانی کی گزارش کی تو موصوف نے ازراہ عنایت اس کو قبول فرمایا، اور انھوں نے اس پر ایک جامع تقریظ بھی لکھی، جس سے اس مقالہ کی وقعت بڑھ گئی۔ الحمد للہ وہ مقالہ اب زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس مقالہ کے لکھتے وقت بار بار مواد کی ضرورت پڑتی تھی، میرے عزیز دوست مولوی شفیق احمد صاحب سلمہ سے مواد کی اعانت کی خواہش کرتا، وہ میرے لئے مختلف کتابوں سے مواد تلاش کر کے لاتے، اور میں اس سے فائدہ اٹھاتا تھا، اللہ تعالیٰ ان مخلصین کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

میں ندوۃ العلماء میں جون ۱۹۵۸ء میں داخل ہوا تھا اور مارچ ۱۹۶۳ء میں فارغ ہوا، اس کے بعد مسلسل پیسیوں امتحانات پاس کئے، لیکن جو کچھ سیکھا یہیں سے سیکھا اور آگے بڑھنے کی ہر راہ ندوہ سے ملتی تھی، گویا یہ وہ شاہراہ تھی کہ دوسری پگڈنڈیاں اور راستے اس میں آکر ضم ہو جاتے تھے۔ ان شاء اللہ زندگی کی دوسری منزلوں میں ندوہ کا تذکرہ آتا رہے گا، جس کے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔

طالب علمی کی زندگی کا خلاصہ

جب ۲۳ سال کا تھا، اپنی اصطلاحی طالب علمی کا دور ختم ہو گیا، گو حقیقۃً طالب علم اب بھی ہوں، عمر کے ۵۶ ویں سال میں طالب علمی کی سطح سے ذرا بھی بلند نہیں ہوا ہوں، ظاہر ہیں اور بستلائے فریب دنیا، حافظ، قاری، عالم، فاضل، مفتی وہ جو بھی سمجھے، اور جس لقب سے چاہے پکارے، اپنی حقیقت تو اپنے ہی پر خوب روشن ہے، آج تک نرا طالب علم ہوں، وہ بھی اعلیٰ نہیں ادنیٰ قسم کا، غرض اس طرح طالب علمی کا اصطلاحی و رسمی زمانہ جو سمجھا جاتا ہے، وہ عمر کے ۲۳ ویں سال فبروری ۱۹۶۳ء میں ختم ہو گیا۔ آہ وہ زمانہ کی تلخیاں و ناکامیاں اور مایوسیاں۔ یہ سب تو لازمۂ بشریت ہیں، اور ہر عمر کے ساتھ لگی ہوی ہیں۔ لقد خلقنا الانسان فی کبد۔ لیکن اس کے باوجود وہ زمانہ کتنی بے فکری، کتنی آزادی اور کتنی غیر ذمہ داری کا تھا، وہ زندگی اب کہاں سے واپس لائی جائے۔

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

پانچ سال کی عمر میں بسم اللہ ہوی، چھٹے سال ایک اسکول میں داخلہ ہوا، اس وقت سے مدرسہ کی فراغت تک گویا طالب علمی کی کل عمر ۱۸ سال کی ہوی۔ ہائے کیا خیال اس وقت تھا کہ اب یہ دن پھر کبھی نہیں آئیں گے، اور ادنیٰ جھلک بھی ان دنوں اور راتوں کی نصیب نہ ہوگی۔

اے جوانی تجھے اب لاؤں کہاں سے

کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

دنیا سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی

جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

اے رب ذوالمنن ! آپ نے تو عمر کی وہ نعمت دی تھی کہ اس کے ایک ایک دن کی قیمت دنیا جہاں میں کوئی لگا ہی نہیں سکتا، جو قوتیں، صلاحیتیں اور جو توانائیاں اس وقت موجود تھیں، کاش ان کے اقل قلیل حصہ کی بھی قدر اس وقت ہو گئی ہوتی !

آج جب اس کا جائزہ لے رہا ہوں تو محسنوں، مربیوں، استاذوں اور دوستوں کے ہجوم میں گنتی کی صورتیں ایک ایک کر کے آرہی ہیں۔

اللہ ان سب محسنوں کو ان کے لائق جزائے خیر دے۔ غور کرتا ہوں تو پاتا ہوں کہ نہ کسی استاذ کا حق شاگردی ادا ہوا، اور نہ کسی رفیق درس کا حق رفاقت۔

تھا زور کبھی خود بینی کا کرتے ہی کیا تھے ہم ہم کے سوا
اور اب تو زباں پر کچھ بھی نہیں رب اغفر و ارحم کے سوا

ربنا ظلمنا أنفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد مزید ایک ماہ ندوہ میں قیام رہا، یہ وقت کتابوں کے مطالعہ اور اساتذہ کرام سے استفادہ کا تھا۔ اور اسی زمانہ میں جامعہ نظامیہ فرنگی محل (جو کسی زمانہ میں عالمی شہرت کا حامل تھا) اور جہاں کے علماء مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ اور مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ دنیائے اسلام میں مشہور و معروف تھے، اور اب وہ مدرسہ بند ہو چکا ہے، لیکن اس زمانہ میں وہاں سے خانگی امتحان کا انعقاد عمل میں آیا کرتا تھا۔ میں وہاں کے آخری درجہ کے امتحان "مولانا" میں (جو

درجۂ فضیلت کے برابر تھا) بیٹھ کر درجہ امتیازی (اعلیٰ درجہ) میں کامیاب ہوا۔ اور "مولانا" کی سند حاصل کی۔ دراصل اس جامعہ سے تعلق، اس طرح پیدا ہوا کہ جامعہ نظامیہ حیدرآباد دکن سے میں نے حفظ کیا تھا، اور اس کے بانی حضرت مولانا انوار اللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے شاگردی کا تعلق تھا اور اعلیٰ حضرت حضور نظام آصف سابع کی ایک بڑی امداد اس مدرسہ کو حاصل تھی۔ غالباً اسی وجہ سے یہاں کے امتحان میں میرے داخلہ کی راہیں ہموار ہوئیں، اور اسی حیدرآبادی نسبت سے وہاں کے ذمہ داروں نے بخوشی امتحان کی اجازت دے دی۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو جزائے خیر دے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے جدائی

۲۹/ مارچ ۱۹۶۴ء میں ندوہ سے جدا ہوا، دارالعلوم گویا میرا دوسرا وطن تھا، مدرسہ وکٹوریہ حیدرآباد میں ۹ سال سے ۱۴ سال کی عمر گزری، یہ معصومیت کا دور تھا، اور ندوۃ العلماء میں ۱۹ تا ۲۳ کی عمر گزری اور یہ عین شباب کا دور تھا، یہ دونوں مدرسے مجھے بیحد محبوب ہیں، پہلے مدرسہ میں معصومانہ غیر ذمہ داریاں تھیں اور یہاں زندگی کا ہر دن ذمہ داری کا تھا۔ اور الحمدللہ ندوہ کی تعلیم نے ہر آنے والی زندگی میں ذمہ داریوں کو سنبھالنے میں مدد دی۔ اسی ندوہ کے تعلق نے "ندوی" کو میرے اور میری اولاد کے نام کا ایک جز بنا دیا ہے، یہ تعلق میرے لئے دارالعلوم سے فراغت کا تعلق تھا، لیکن حکومت امریکہ نے اس کو ایک خاندانی نسبت سمجھا، اور میری اولاد کے نام کے ساتھ بھی ندوی لکھ دیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میری مادر علمی ہی نہیں بلکہ اب وہ ہمارے لئے ماں اور باپ دونوں ہے۔ "ندوی" والی نسبت ہمیشہ اس چیز کو یاد دلاتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو تاقیام قیامت آباد رکھے اور ان کے بانیوں و سرپرستوں اور اساتذہ کرام کو ان کے مرتبہ کے مطابق اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین!

ندوۃ العلماء لکھنؤ سے جب حیدرآباد پہنچا تو ۳۱/ مارچ ۱۹۶۳ء کی تاریخ تھی۔ اب حیدرآباد وطن ہونے کے باوجود میرے لئے بالکل نیا تھا، یہاں کوئی بھائی تھے نہ دوست و احباب، احباب تو پہلے ہی سے دور تھے، اور بھائیوں کی ملازمتیں شہر سے دور تھیں، بچپن کے ایک ساتھی اور جگری دوست محمود بیگ صاحب کے گھر اتر اوہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے، ان کا چھوٹا سا مکان تھا، اور ان کے متعلقین بہت زیادہ تھے تین دن تک میزبانی کی، راتوں میں محلہ کی مسجد میں سو رہتا، اس وقت والدہ ماجدہ نلگنڈہ میں مقیم تھیں۔

باب (۱۲)

جستجوئے معاش

اب مجھے روزی کی فکر لاحق ہوئی اور ملازمت کی تلاش شروع ہوئی، لکھنؤ سے جب سفر شروع ہوا تو "دائرۃ المعارف العثمانیہ" کا خیال اور وہاں خدمت کرنے کا جذبہ بار بار آتا رہا۔ یکم اپریل ۱۹۶۳ء میں حیدرآباد پہنچا تو اس کے دوسرے دن بعد نماز فجر (ہمارے بچپن کے ساتھی) مولانا الطاف حسین صاحب (اب وہ ہمارے مدظلہ ہیں) کے پاس گیا، اور ان سے دائرۃ المعارف کے حالات معلوم کئے، موصوف نے فرمایا کہ مصحح کی تین جائیدادیں خالی ہیں اور بارہ امیدوار ہیں۔ (گویا ایک انار سو بیمار) اور ڈاکٹر عبدالمعید خاں صدر شعبہ عربی جامعہ عثمانیہ اس ادارہ کے ناظم ہیں۔ وہاں سے نکل کر حضرت مولانا عبداللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا، (یہ میرے والد ماجد کے پیر و مرشد تھے) حضرت سے بچپن ہی سے تعلق تھا، اور میرے لئے وہ اب گویا پیر و مرشد تھے، ان سے "دائرۃ المعارف" کی ملازمت کا ذکر کیا، اور دعا کی درخواست کی، حضرت نے دعا فرمائی اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ کیا ڈاکٹر عبدالمعید خاں کو کوئی سفارش نامہ لکھ دوں، پھر انھوں نے ہی ایک کاغذ کے پرزے پر دو لفظی

سفارش لکھ دی کہ "مولوی غوث ندوی سلمہ کو دائرہ میں مصحح کی حیثیت سے تقرر کی سفارش کرتا ہوں۔ فقط عبداللہ شاہ"۔

ان کی قیام گاہ سے سیدھے جامعہ عثمانیہ پہنچا، اور ڈاکٹر عبدالمعید خاں سے ملاقات کی اور اپنا مدعا ظاہر کیا، موصوف نے عربی میں پہلے میری زندگی کے حالات پوچھے پھر اردو اور انگریزی میں بعض علمی سوالات کئے، میں نے تشفی بخش جوابات دئے۔ انھوں نے از راہ عنایت اسی وقت دائرۃ المعارف کے صدر المصححین مولانا سید رشید پاشاہ صاحب کو میرے تقرر کا فرمان لکھا، اور تحریر فرمایا کہ آج ہی سے مولوی محمد غوث ندوی کو کام پر رجوع کر لیا جائے، اس تقرر نامہ کے لینے کے بعد حضرت عبداللہ شاہ صاحب مرحوم کا وہ سفارش نامہ ان کے حوالہ کیا، وہ ان کے پیر و مرشد بھی تھے، اس پرزۂ قرطاس کو انھوں نے چوما اور آنکھوں سے لگا کر جیب میں رکھ لیا، اور کہا ان کو تم نے کیوں زحمت دی؟

دائرۃ المعارف کی اس وقت عالمی شہرت تھی۔ یہاں پر مصحح کی حیثیت سے کام مل جانا گویا ایک بہت بڑا اعزاز تھا، میں نے یہاں پر تین سال مسلسل بڑی محنت کے ساتھ کام کیا، جس کی وجہ سے علمی استعداد میں اضافہ ہوا کیونکہ دائرۃ المعارف کا ماحول سرتاپا علمی تھا۔

غرض وہاں ہر طرح کی عربی کتابوں کا مطالعہ شروع ہوا، تحقیق کے لئے تفسیر، حدیث، تاریخ ہر طرح کی کتابیں مطالعہ میں رہتیں، علمی مواد کو جمع کرنا، پروف ریڈنگ کرنا، تصحیح کے دیگر مراحل سے گزرنا اور مخطوطات کو کتابی شکل میں لکھنا، اور قلمی مخطوطات کو پڑھنا اور مقابلہ کرنا اور پھر ان کے اختلافات کو بتانا، گویا یہ تصنیف و تالیف کی ایک مستقل دنیا تھی، جو آنے والی زندگی میں ہر طرح کام آئی، خصوصاً میری ڈاکٹریٹ (Ph.D) کی تحقیقی کتاب "کتاب التبصرۃ فی القراءات السبع

میں یہاں کا تجربہ بیحد کام آیا اور پھر بعد کی عربی تالیفات و تحقیقات میں بھی میں ندوہ کے بعد دائرۃ المعارف کا احسان مند ہوں کہ اس نے مجھ کو یہ سلیقہ عطا کیا۔

دائرۃ المعارف چھوڑنے کی جگہ نہ تھی، اگر معاشی حالات اچھے ہوتے تو اس کو میں ہرگز نہ چھوڑتا۔ میری تنخواہ ان پورے تین سالوں میں ۹۹ روپئے سے زائد نہ تھی اور ملازمت عارضی، ان میں، میں اپنی والدہ ماجدہ کی مدد کے ساتھ ازدواجی زندگی شروع نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے دائرہ کی ملازمت جو ۱۹۶۳ء سے شروع ہوی اسی معاشی مجبوری سے جون ۱۹۶۶ء میں میرے استعفاء کے ساتھ ختم ہوی۔ لیکن بعد کی جتنی بھی تحقیقات و تالیفات ہیں، اسی دائرہ کی عظیم الشان لائبریری کے سایہ میں پوری ہویں، اور ندوہ کے اساتذہ کے علاوہ وہاں کے بعض باصلاحیت مصححین کے مشورے (جیسے مفتی محمد عظیم الدین صاحب، مولانا محمد عمران اعظمی عمری صاحب اور مولانا الطاف حسین صاحب) میرے معاون و مددگار ثابت ہوے اور " ph.D " کی تحقیق " **التحقیق العلمی فی قراءات القرآن السبع والتعلیق علی کتاب التبصرۃ فی القراءات السبع** " بھی یہیں پہلی بار " ڈاکٹریٹ " کی سند کے لئے زیور طباعت سے آراستہ ہوی۔

باب (۱۳)

ازدواجی زندگی (حصہ اول)

شادی کے پیامات کا سلسلہ ۱۸ سالہ زندگی کے دوران مدراس میں ۱۹۵۸ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ لیکن علم کی راہ میں، میں اس کو ایک بہت بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا، ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد دائرۃ المعارف میں ملازمت کا سلسلہ جب قائم ہوا تو

اب شادی کے لئے رشتے شروع ہوے ۔اپنوں اور غیروں میں پیامات کا سلسلہ جاری تھا، کہیں ہماری طرف سے رکاوٹ تھی تو کہیں ہماری پسند کے باوجود دوسری طرف سے رکاوٹ تھی، ادھر والی رکاوٹ معاشی تھی یعنی دائرہ کی عارضی ملازمت اور ۹۹ روپئے ماہانہ تنخواہ، بعض اچھے دل پسند رشتے اسی لئے ہوتے ہوتے ٹوٹ گئے کہ اس وقت ناداری اور مستقل ذریعہ معاش نہ تھا۔ میں نے اللہ سے رو رو کر دعائیں کی کہ پروردگار تو نے جب مجھے پیدا فرمایا ہے تو میرا جوڑا بھی یقیناً پیدا کیا ہوگا، اے خالق جلد میرے لئے نیک جوڑا دلادے ۔دعا وقت پر قبول ہوی، جس کا تذکرہ سن کر آپ بحد محظوظ ہوں گے، اور اسے ہم ملیشیا کے سفر کے بعد بیان کریں گے۔

ملیشیا کے عالمی مقابلۂ قراءت میں شرکت

جنوری ۱۹۶۴ء میں عالمی مقابلۂ قراءت ملیشیا کے سلسلہ میں حکومت ملیشیا نے حکومت ہند سے دو قراء کو اس مقابلہ میں شرکت کی دعوت دی ۔ حکومت ہند نے ہر اسٹیٹ سے کل ہند سطح کے مقابلہ کے لئے دو قراء کو دہلی میں شرکت کی دعوت دی ۔ پہلے ہر اسٹیٹ میں مقابلہ ہوا، آندھراپردیش سے میرا انتخاب دہلی کے لئے ہوا، کلچرل سنٹر نئی دہلی میں ۴۰ قراء کے درمیان مقابلہ ہوا، ان میں دو قراء کا عالمی مقابلہ کے لئے انتخاب عمل میں آیا، ایک میں تھا اور دوسرے میرے استاذ قاری عبدالباری حیدرآبادی تھے ۔جنوری ۱۹۶۴ء کے وسط میں ہم بذریعہ طیارہ کوالالمپور ملیشیا پہنچے، ۲۰/ جنوری سے مقابلہ شروع ہوا، پہلے ۳ دن ملیشیا کے صوبوں کے درمیان انتخاب تھا، اور آخری ۳ دن عالمی مقابلہ ہوا، اس بین الاقوامی مقابلۂ قراءت میں ساری دنیا سے ۳۶ قراء نے حصہ لیا اور میرا ان قراء میں مقابلہ کے بعد چوتھا نمبر تھا، ساتویں دن حکومت ملیشیا نے اس اعزاز میں ایک سونے کا تمغہ دیا اور ۵۰۰ ڈالر انعام میں عطا کئے، واپسی میں ہم کچھ دن سنگاپور میں ٹھیرے ۔اور فروری ۱۹۶۴ء کے پہلے ہفتہ میں

ہندوستان واپسی ہوی۔ہندوستان واپسی پر ہمارے اعزاز میں عظیم الشان جلسے منعقد ہوے، یہ جلسے دہلی میں دو جگہ جامع مسجد اور تاج المساجد میں ہوے، اور حیدرآباد کی بیسیوں مساجد میں جلسوں کا سلسلہ کوئی تین چارہ ماہ تک جاری رہا۔

ایک عظیم الشان جلسہ ضلع نلگنڈہ میں ہوا، جس میں تقریباً ۷ ہزار مسلمان شریک تھے، کیونکہ یہ میرا وطن بھی تھا، اور نلگنڈہ کے مسلمان میرے اس اعزاز کو اپنا اعزاز سمجھتے تھے، میں نے نماز عشاء کے بعد ایک گھنٹہ تک کلام پاک کی تلاوت مختلف عربی لحنوں میں کی، داد و تحسین اور اللہ اکبر کے نعرے ہر طرف سے بلند ہو رہے تھے، جلسہ شروع ہونے سے قبل میرے ایک رشتے کے ماموں عبدالخالق مسافر نلگنڈوی نے میرا تعارف کروایا۔اور قراءت کے بعد میں نے کوئی آدھا گھنٹہ تقریر کی جس میں تجوید و قراءت کے اہمیت کے ساتھ ساتھ مسلمانان ضلع نلگنڈہ کا اس اعزاز و اکرام پر شکریہ ادا کیا۔ یہ واقعہ اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اسی رات جلسہ کے ختم پر میری ازدواجی زندگی کے باب کا آغاز ہوتا ہے۔اور اس کی تفصیل یہ ہے۔

ازدواجی زندگی کا پہلا باب

۱۵/ اپریل ۱۹۶۴ء کی رات یہ اعزازی جلسہ منعقد ہوا تھا، اس جلسہ میں میرے ہونے والے خسر حضرت محمد مولانا صاحب نائک تشریف فرما تھے، ان کی نظر انتخاب ان کی تیسری لڑکی کے لئے مجھ پر پڑی، اور انھوں نے جلسہ کے بعد میرے خلیرے ماموں عبدالرحیم صاحب سے اس کا تذکرہ کیا، اور اسی رات انھوں نے اس رشتہ کے سلسلہ میں استخارہ بھی کیا، اور اس استخارہ کے نتیجے میں وہ پرامید تھے، میرے قریبی بزرگوں میں میرے خلیرے ماموں ہی تھے، حضرت والد ماجد صاحب کا ۱۹۶۲ء میں انتقال ہو چکا تھا، ماموں صاحب نے والدہ سے تذکرہ کیا اور والدہ صاحبہ نے مجھ سے ذکر کیا اور یہ طے پایا کہ عیدالاضحیٰ ۱۳۸۳ھ کے دوسرے دن والدہ ماجدہ اور ماموں

صاحب لڑکی کو دیکھنے دورہ کنٹہ (میرے موجودہ سسرال) جائیں گے اور اگر لڑکی پسند آئی تو منگنی کی رسم انجام دیں گے۔ (یعنی بات پکی کر آئیں گے)۔

۱۱/ ذوالحجہ ۱۳۸۳ھ کو دورہ کنٹہ روانگی کے ایک دن قبل (عید الاضحیٰ کے دن) ہمارے ماموں نلگنڈہ سے حیدرآباد پہنچے اور یہ پیغام سنایا کہ مجھے بھی ان کے ساتھ کل چلنا ہے، میں نے انکار کیا اور کہا کہ اس وقت میری وہاں ضرورت نہیں، لیکن ماموں صاحب اور والدہ صاحبہ کے حکم کو میں ٹال نہیں سکتا تھا اس لئے راضی ہو گیا۔

ہمارا یہ مبارک سفر ۱۱/ ذوالحجہ ۱۳۸۳ھ مطابق ۲۵/ اپریل ۱۹۶۴ء کی صبح ۸ بجے بروز جمعہ شروع ہوا اور ٹھیک ایک بجے دن ہم دورہ کنٹہ (ضلع نلگنڈہ) پہنچے۔ ہماری آمد کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا، جمعہ کی اذان ہو چکی تھی لیکن خطبہ و نماز کے لئے کچھ دیر تاخیر ہوی۔ غرض ہم نہا دھو کر مسجد پہنچے، سنت پڑھی اور خطبہ و نماز کے لئے مجھے حکم ہوا۔ نماز سے فراغت کے بعد کھانا کھایا، اور میں نے قیلولہ کیا، والدہ ماجدہ اور ماموں صاحب دونوں نے لڑکی کو دیکھا اور پسند کیا۔ عصر کی نماز سے قبل مجھے بیدار کیا گیا، اور ہم نماز عصر کے لئے مسجد چلے گئے، واپس گھر پہنچے تو چائے پی، والدہ ماجدہ اس وقت میرے پاس مسکراتے ہوے تشریف لائیں، اور کہا بیٹے! لڑکی مجھے بیحد پسند ہے، دیندار گھرانہ ہے، اور دینداری کے بارے میں اس لڑکی کی شہرت پہلے بھی سن چکی تھی اور اب اس کا یقین ہو گیا ہے۔ تو میں نے کہا امی جان اگر لڑکی آپ کو پسند ہے تو پھر مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ میں بھی اس رشتہ سے راضی و مطمئن ہوں۔ آپ لڑکی کو انگوٹھی پہنا دیجئے اور بات پکی کر دیجئے، تین ماہ بعد شادی کی تاریخ مقرر کر دیجئے تاکہ کچھ ضروری انتظامات ہو سکیں۔ اس پر وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگیں، کہ نہیں "شادی آج ہی ہو گی"۔ میں دل میں یہ خیال کر رہا تھا کہ وہ میرا دل دیکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے کہا امی جان اگر آپ کا یہی حکم اور مرضی ہو تو میں ہر طرح

راضی ہوں ۔ عصر بعد گاؤں میں اعلان ہوا کہ نکاح مغرب بعد ہوگا، اور ہر قریب کے قصبہ میں مسلمانوں کو شرکت کی اطلاع بھجوادی گئی ۔

قبل اس کے کہ میری شادی میں آپ بھی شرکت فرمائیں، اس سسرالی رشتہ کا حسب نسب بھی سن لیں ۔ حضرت خسر محترم کا سلسلۂ نسب حضرت ٹیپو سلطان شہید رحمۃ اللہ علیہ سے جاملتا ہے، ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ان کی ایک اولاد حیدرآباد اور دوسری اولاد کلکتہ چلی گئی تھی، یہاں آصف ثالث نظام علی خان نے انھیں ایک بڑی جائداد چھ ہزار ایکڑ کی عطا کی تھی اور حیدرآباد کی مشرقی سرحد کی حفاظت کے ساتھ ساتھ نائک کا خطاب عطا کیا تھا، یہ جاگیر "دورہ کنٹہ" کی جاگیر تھی ۔ اس گھرانے میں بڑے بڑے بہادر اور صاحب سطوت بزرگ گزرے ہیں ۔ میرے خسر حضرت محمد مولانا صاحب بڑے صاحب علم و فضل اور نہایت متقی آدمی تھے، پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد میں تقریباً ۳ سال روپوش رہے جس کی وجہ سے ان کو تخلیہ کنندہ قرار دیا گیا اور ساری جائیداد کسٹوڈین میں چلی گئی ۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کی بڑی راہ و رسم تھی ۔ ان دونوں بزرگوں کا مقام مسٹر نہرو کے پاس جو کچھ تھا اس سے تو آپ واقف ہوں گے، مولانا آزاد تو سیاست میں نہرو کے استاذ تھے اور انھیں کے توسط سے مسٹر نہرو نے ان کی زمین کو واپس کرنے کا حکم نامہ جاری کیا تھا ۔ اس طرح وہ دوبارہ اپنے وطن دورہ کنٹہ سارے لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ جو حیدرآباد میں مقیم تھے چلے گئے ۔ پھر اس جاگیر کو، جو اب زمینداری میں منتقل ہو گئی تھی بڑی ترقی دی، اور آخیر زمانے تک سارے تلنگنڈہ میں ان کی شہرت اور نیک نامی رہی ۔

باب (۱۴)

شادی خانہ آبادی

۱۱/ ذوالحجہ ۱۳۸۳ھ کو ہم دورہ کنٹہ پہنچے ۔جمعہ کی نماز کے بعد والدہ ماجدہ نے لڑکی کو دیکھا، عصر بعد پسندیدگی کی اطلاع دی ، اور مغرب بعد شادی کا اعلان ہوا ۔ مغرب تک سینکڑوں مسلمان دورہ کنٹہ پہنچ گئے ، قصبہ کے اکثر ہندو بھی اس محفل میں شریک ہوے ، کسی دیہات سے قاضی النکاح کو بلوایا گیا ، میں جمعہ کے دن جو صاف ستھرے کپڑے پہنے انھیں کپڑوں میں میں محفل نکاح میں آیا ، دلہن کو اس وقت کے عمدہ کپڑے جو بھی میسر تھے پہنائے گئے ، اور ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے شب ، نکاح کی کارروائی شروع ہوی ، پہلے کاغذی کارروائی کو مکمل کیا گیا ، پھر قاضی صاحب نے خطبہ نکاح پڑھنا شروع کیا ، نکاح کے خطبہ میں حمد و صلاۃ تک تو انھوں نے ٹھیک پڑھا ، لیکن جب وہ قرآن کی آیات پڑھنے لگے تو غلط سلط پڑھنے لگے ، میں نے انھیں رکوادیا ، پھر میں نے خود ہی اپنا خطبۂ نکاح پڑھا ، اور نکاح کے عنوان پر ایک مختصر سی تقریر کر ڈالی ، ایجاب و قبول کی کارروائی بھی میں نے ہی خود پوری کی ۔اس کے بعد حضرت خسر محترم سے دعا کی درخواست کی ، دعا کے بعد عشائیہ ہوا ، سینکڑوں افراد نے اس کھانے میں شرکت کی ۔

شادی کے موقع پر حسب حیثیت مہر کا تعین ہوا ۔اس طرح یہ خوشی کی ساعت پوری ہوی ۔جمعہ کا دن تھا ، ۲۵/ اپریل ۱۹۶۴ء کی تاریخ ، آج سے بڑھ کر مسرت کا دن زندگی بھر میں یاد نہیں پڑتا ، شادی میں ہمارے احباب کی طرف سے صرف والدہ ماجدہ اور ماموں صاحب شریک تھے ۔ میری ایک بہن اور چار بھائی حیدرآباد میں موجود تھے ، ان کو اس شادی کی اطلاع نہ تھی ۔انھیں صرف یہ معلوم تھا کہ لڑکی کو

دیکھنے جارہے ہیں۔اگر لڑکی پسند آئی تو بات طے ہوگی ورنہ کچھ نہیں۔

اس طرح عشاء کی نماز کے بعد بھی آدھی رات تک کھانے کا سلسلہ چلتا رہا، کوئی بارہ بجے شب لڑکی کی وداعی کا مسئلہ پیش آیا، سسرال والوں نے کہا کہ لڑکی کی وداعی دو ماہ بعد عمل میں آئے گی، اور اس وقت (وہاں کے رواج کے مطابق) جہیز وغیرہ کے ساتھ لڑکی کو وداع کیا جائے گا۔یہ موقع بڑا نازک تھا، میں نے کہا کہ "جہیز نہ ہم نے طے کیا ہے اور نہ ہی ہم کو اس کا مطالبہ ہے، رہا لڑکی کو جو کچھ لینا دینا ہے یہ تو والدین کی مرضی پر منحصر ہے جو کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔اس وقت نہ اس کی ضرورت ہے اور نہ ہی ہماری طرف سے کسی قسم کا کوئی مطالبہ ہے۔لیکن وہ کسی طرح وداعی کے لئے تیار نہ تھے، اور یہ کہہ رہے تھے کہ احباب میں ہماری ناک کٹ جائے گی اگر ہم نے یوں ہی لڑکی کو رخصت کیا اور جہیز نہ دیا۔ہم نے صفائی سے کہہ دیا کہ یہ شرعی ضرورت نہیں ہے اس لئے وداعی آج ہی کی شب ہونی ضروری ہے، غرض وہ بادل ناخواستہ راضی ہوگئے اور ٹھیک تین بجے شب وداعی عمل میں آئی، اور مزید طے ہوا کہ رات یہیں قیام رہے گا، صبح شادی کا قافلہ واپس جائے گا۔ہم نے اس کو منظور کر لیا۔دوسرے دن ناشتہ بعد پھر وہی بات نکل آئی کہ "جہیز کے ساتھ ہی ہم لڑکی کو روانہ کریں گے" ہم اپنی بات پر پھر اڑے رہے، اور کسی طرح انھیں سمجھا منا کر راضی کر لیا، اور حیدرآباد دلہن کو ساتھ لے آئے۔حیدرآباد جب ہم پہنچے تو بھائی بہن ہماری آمد کے منتظر تھے، موٹر سے جب ہم اترے اور "دلہن" کو اتارا تو کہنے لگے کہ یہ لڑکی کون ہے۔میں نے کہا یہ آپ کی بھاوج ہے، کہنے لگے کہ تم نے شادی کر ڈالی، ہم نے کہا ہاں، تو انھوں نے کہا آخر ہم کو کیوں بلوایا نہیں گیا، میں نے کہا کہ شادی میری تھی، اس لئے وہاں میری ضرورت تھی، آپ لوگوں کی نہ تھی، پھر ہم نے ساری تفصیل بیان کی اور خدا کے شکر گزار ہوئے کہ اس نے "سنت مطہرہ" کے مطابق شادی کرادی۔شادی کا وہ دن تھا اور آج کا یہ دن ہے، ۳۳ سال گزر چکے ہیں، اللہ

تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل سے دینی و دنیوی برکتوں اور سعادتوں سے نوازا ہے اور نواز رہا ہے۔ شادی ۲۵ سال کی عمر میں کی تھی اور اب میری عمر ۵۶ سال ہے، تقریباً ۳۳ سالہ زندگی الحمدللہ ہنسی خوشی گزر رہی ہے۔ غرض شادی کے بعد دلہن کو لے کر جب میں حیدرآباد آیا تو گھر میں سلیقے کے برتن تک نہ تھے اور سونے کے لئے نہ کوئی پلنگ بستر تھا، میری بیوی جو ناز و نعم میں پلی ہوی تھیں، کبھی بھی اس کی شکایت نہ کیں بلکہ وہ صبر و شکر کے ساتھ ان سارے مصائب کو برداشت کرتی رہیں، میں دائرۃالمعارف میں ملازمت کرتا تھا تنخواہ ۹۹ روپئے ماہانہ تھی، گھر کا کرایہ ۲۸ روپئے تھا جو صرف ایک کمرہ و دالان پر مشتمل تھا، لائٹ اور نل کے ۲ روپئے مزید دینا ہوتا تھا، اس طرح ۶۹ روپئے بچ رہتے تھے، اس میں گھر کا خرچ چلانا قطعی مشکل کام تھا، لیکن اللہ میری بیوی کو جزائے خیر دے کہ وہ نہایت سلیقہ سے کسی شکوہ و شکایت کے بغیر سارے گھر کے کاروبار چلاتی رہیں اور اس زندگی پر وہ بیحد خوش و خرم تھیں۔

شادی کے چند ماہ بعد اعلیٰ حضرت حضور نظام آصف سابع کے حکم سے میں نے عربی زبان میں ان کے استاذ محترم حضرت مولانا انوار اللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی حیات پر ایک مقالہ لکھا جو ان کے عرس میں پڑھنا تھا، میں نے اس مقالہ کو نہایت عمدگی سے پڑھا اور مشائخ اور علماء کی طرف سے داد و تحسین پایا۔ دوسرے دن اعلیٰ حضرت کی طرف سے طلبی ہوی۔ انھوں نے اس مقالہ کو بیحد پسند فرمایا (جو اسی دن امیر جامعہ نے ان کی خدمت میں پیش کر دیا تھا) اور خلعت سے سرفراز فرمایا اور ایک کثیر رقم تحفتہً عطا کی۔

اللہ کی اس نوازش کی وجہ سے گھر کی ضروری چیزیں خریدی گئیں۔ غرض اس وقت ہم صبح و مساء خدائے لایزال کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ اس طرح خوشی و مسرت کے ساتھ یہ زندگی گزرنے لگی۔

اسی درمیان جناب نواب یوسف علی خاں صاحب (یوسف باغ) سے راہ و رسم بڑھی، اور وہ مجھ پر والد جیسے مہربان ہوے، وہ مسجد محبوب النسا۔ بیگم کے بانی اور متولی تھے۔ انھوں نے اپنی مسجد کے مدرسہ میں قراءت و تجوید اور دینیات کی تعلیم پر پڑھانے کے لئے مجھے مقرر فرمایا، یہ صباحی مدرسہ تھا اور روزانہ دو گھنٹے تعلیم ہوتی تھی، اس تعلیم پر وہ معقول ھدیہ دیتے تھے۔ جو میرے اور میرے اہل خانہ کی کفالت کے لئے بہت کافی تھا۔ پھر جمعہ کی خطابت میرے ذمہ کی اور انھوں نے ھدیہ میں اضافہ کیا۔

دائرۃ المعارف کی ملازمت عارضی تھی، ہر سال دو تین دن کے لئے علحدگی کی نوٹس ملتی تھی تاکہ مستقل ملازمت کا استحقاق نہ پیدا ہو جائے، اور تنخواہ یکمشت ۹۹ روپئے ماہانہ تھی، اور کبھی رخصت کی نوبت آجاتی تو تنخواہ کٹ جاتی، یہ دراصل دائرہ کی ایک شدید مجبوری تھی جو حکومت ہند اور جامعہ عثمانیہ کے باعث تھی۔

۱۵/ جون ۱۹۶۶ء سے میرا تقرر اسلامیہ ہائی اسکول میں بحیثیت مدرس ہوا تھا، اس لئے دائرۃ المعارف سے اب مستعفی ہونا ضروری تھا۔ میں نے ۲/ جون ۱۹۶۶ء کو ناظم صاحب سے مستعفی ہونے کی گزارش کی، وہ نہ مانے اور کہا کہ سب حالات درست ہو جائیں گے، کچھ دن بعد وہ روس کے سفر پر تھے اور ایک قائم مقام ناظم آئے، میں نے ان سے استعفا کی خواہش کی اور انھوں نے اسی وقت استعفا کو منظور کر دیا، یہ ۱۴/ جون ۱۹۶۶ء کا واقعہ ہے۔ دائرہ میں آمد یکم اپریل ۱۹۶۳ء کو ہوی تھی، اس طرح جملہ تین سال اس علمی گہوارے میں بسر ہوے۔

باب (۱۵)

دیگر حالات زندگی اور جامعات کے امتحانات کا سلسلہ

مدرسہ، کالج اور جامعہ میں ملازمت کے لئے بعض امتحانات کا پاس کرنا ضروری تھا، جس کے بغیر نوکری نہ ملتی تھی، اس لئے خانگی طور پر بعض امتحانات دینے پڑے :

ندوۃ العلماء سے "عالمیت" کی سند کے بعد جامعہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ سے "مولانا" کی سند حاصل ہوی۔ اب ۱۹۶۵ء سے دیگر امتحانات کا سلسلہ شروع ہوا اور ۱۹۸۰ء میں (ph.D) پر ختم ہوا۔

(الف) سب سے پہلے ۱۹۶۵ء میں "ادیب کامل" کا امتحان جامعہ علیگڈھ سے درجہ اول میں پاس کیا۔

(ب) اس کے فوراً بعد ۱۹۶۵ء میں (B.O.L) کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا

۱۵/ جون ۱۹۶۶ء کو اسلامیہ ہائی اسکول سکندرآباد میں اردو و عربی کے مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا، یاد رہے اس سے ایک دن قبل دائرہ سے مستعفی ہو چکا تھا۔ اور یہ نیا سلسلۂ ملازمت ۷/ جون ۱۹۷۳ء تک جاری رہا اور مشاہرہ ۲۰۰ ماہوار سے شروع ہوا اور ۱۹۷۳ء میں بڑھ کر ۳۷۵ روپئے ماہوار ہو گیا تھا۔

اسلامیہ ہائی اسکول کی ملازمت کے زمانہ میں خانگی طور پر کئی امتحانات پاس کئے، اور وہ یہ ہیں : (۱) B.O.L عربی میں (۲) B.A (۳) B.ED (۴) M.O.L اردو میں (۵) M.A عربی میں۔ شروع کے چاروں امتحانات درجہ اول سے پاس کئے اور ایم اے (عربی) امتیازی درجہ میں۔

ایم اے (عربی) میں امتیازی کامیابی پر عثمانیہ یونیورسٹی نے گولڈ میڈل بھی عطا کیا۔ اور دوسرے ہی ہفتہ انوار العلوم ڈگری کالج میں بحیثیت لکچرار و صدر شعبہ

عربی تقرر عمل میں آیا۔اور اب میری تنخواہ ۵۵۰ ماہوار تھی۔اور بڑھتے ہوئے ۱۹۸۰ء میں ۴۰۰۰ ہو گئی تھی۔ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

انوار العلوم کالج میں میرا تقرر ۱۹۷۳ء میں ہوا، اور ۱۹۸۱ء میں جب کہ میں امریکہ جارہا تھا اس ملازمت سے مستعفی ہوا۔

۱۹۷۸ء میں میں نے " Ph.D " میں داخلہ لیا، اور چند ماہ بعد حکومت ہند کی طرف سے پی ایچ ڈی کے لئے " Fellowship " کی منظوری آئی، اس فیلوشپ کی وجہ سے موجودہ تنخواہ کے علاوہ مزید ۵۰۰ روپئے الاونس ملتا تھا، جو پی ایچ ڈی کی تکمیل یعنی ۱۹۸۰ء تک جاری رہا۔اور پی ایچ ڈی کی تکمیل تین سال بعد ۱۹۸۰ء میں ہوی۔ میرے (Ph.D) کا مقالہ جامعہ عثمانیہ میں داخل کرنے سے قبل ہی زیور طباعت سے آراستہ ہوا، جس کی طباعت کی اجازت جامعہ عثمانیہ نے دے دی تھی۔میرے Ph.D کا عنوان یہ تھا :

A Critical study of Quranic recitation along with a critical edition of the manuscript entitled

"کتاب التبصرۃ فی القراءات السبع"

"لأبی محمد مکی بن أبی طالب رحمہ اللہ"۔

Compiled in the year 392 A.H. (died in the year 437 A.H. / 1045 A.D)

اس کتاب کی طباعت عالمی شہرت یافتہ ادارہ " دائرۃ المعارف " میں ہوی اور سارے اسلامی ممالک میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور الحمدللہ اب مشرق وسطی کے مسلم ممالک اور خصوصاً ام القری یونیورسٹی مکہ مکرمہ اور مدینہ یونیورسٹی مدینہ منورہ کے کلیۃ القرآن کے درس نصاب میں پڑھائی جاتی ہے۔(الحمد للہ علی ذلک)۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے پہلے

میری Ph.D کے "Thesis" چار جامعات کے ممتحنین کے پاس بھیجے گئے اور وہ یہ ہیں (۱) جامع الازہر قاہرہ (۲) لندن یونیورسٹی لندن (۳) علیگڈھ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور (۴) عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (جہاں میں Ph.D کر رہا تھا)۔

الحمدللہ سبھوں نے اس "مقالہ" پر امتیازی نمبر دئے۔ سب سے اچھی رپورٹ جامع الازہر قاہرہ کی تھی، صدر شعبہ عربی و اسلامیات نے اپنی رپورٹ اس طرح لکھی "کتاب التبصرۃ فی القراءات السبع" اور اس کے مقدمہ کی تحقیق پر ہم مؤلف و محقق کو دلی مبارکباد دیتے ہیں، اس فن میں یہ سب سے عمدہ تحقیق ہے، اس کام پر ہماری آنکھیں شرم سے جھک جاتی ہیں کہ جو کام یہاں ہونا چاہئے تھا اس کو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے کروایا، ہم شعبۂ عربی جامعہ عثمانیہ اور خصوصاً وہاں کے وائس چانسلر کو اس قابل فخر کتاب پر دلی مبارکباد دیتے ہیں"۔

۱۹۸۰ء کے جلسہ تقسیم اسناد میں جب مجھ کو Ph.D کی ڈگری دی جانے لگی تو وائس چانسلر نے سب سے پہلے مجھ کو ڈائس پر بلوایا، اور فخریہ انداز میں جامع الازہر قاہرہ کی اس عبارت کو (جو عربی و انگریزی میں تھی) پڑھ کر سنایا اور مجھے ایک سونے کا تمغہ عطا کیا۔ اور سب سے پہلے سند Ph.D مجھ کو عطا کی گئی، اور وہ فخریہ کہتے رہے کہ "ہماری یونیورسٹی کا عالم اسلام میں اور وہ بھی عربی زبان میں یہ مقام ہے کہ دنیا کی سب سے ممتاز یونیورسٹی نے ہمارے لئے یہ فخریہ کلمات لکھے ہیں"۔ ڈگری عطا کرنے کے بعد مجھ کو سینے سے لگایا اور فرمایا کہ کل صبح دس بجے تم مجھ سے میرے اجلاس پر ملنا۔

دوسرے دن جب میں وائس چانسلر کے آفس پہونچا تو وائس چانسلر میرے

منتظر تھے، چائے خوری کے بعد ایک لفافہ میرے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ تمہارا تقرر میں نے جامعہ عثمانیہ میں " Readership " کے عہدے پر کر دیا ہے۔ میں شکریہ کے ساتھ واپس ہوا۔ یونیورسٹی چونکہ اس وقت بند تھی، اور مجھ کو چھٹیوں کے بعد یہ جائزہ لینا تھا، لیکن چند ہی دن بعد میں " Visiting Professor " کی حیثیت سے " جامعۃ الملک عبدالعزیز جدہ " چلا گیا، یہاں پر ایک ماہ تک میرے محاضرات ہوتے رہے۔ اور یہ محاضرات میری تحقیقی کتاب پر تھے جو " القراءات السبع " پر لکھی گئی تھی۔ اس کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ایک ماہ محاضرات کا سلسلہ جاری رہا پھر ام القریٰ میں مزید ایک ماہ میں نے اس خدمت کو انجام دیا۔

لندن یونیورسٹی لندن کے صدر شعبہ عربی نے میرے مقالے کو سراہا، طباعت کی ایک عددی غلطی تھی، جو کسی طرح رہ گئی تھی اور وہ صاحب کتاب کی وفات کی تھی، جو غلطی سے A.D 1000 چھپ گئی تھی، انھوں نے صرف وہاں A.D 1045 کی تصحیح کی اور لکھا کہ یہ محقق کی نہیں بلکہ کسی پروف ریڈر کی غلطی تھی، پھر مقالہ کی تعریف میں نہایت ہی عمدہ تحریر لکھی جس کو وائس چانسلر نے پڑھ کر سنایا۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد تو ہماری اپنی جامعات ہیں، انھوں نے بھی دل کھول کر تعریفی کلمات لکھے۔

پی ایچ ڈی کی ڈگری جب ملی تو اس وقت ۴۰ سال کا تھا، اللہ کے فضل و کرم سے ترقی کرتے کراتے جامعہ کا ریڈر (Assistant Professor) ہو گیا تھا۔ اور اسلامی ممالک کی موقر یونیورسٹیوں میں (Visiting Professor) کی خدمات بھی اسی سال انجام دیں۔ اس طرح مزید تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا۔

○○○○○○○

باب (۱۶)

ازدواجی زندگی (حصہ دوم)

بات شادی کی چلی تھی، لیکن بڑھتے بڑھتے آگے نکل گئی، پھر اب ہم واپس اسی عنوان کی طرف آتے ہیں۔ زندگی کے کسی اتار چڑھاؤ سے اس باب کو اب کوئی واسطہ نہیں، اس میں گفتگو صرف اب "زوجیات" ہی کے سلسلہ کی ہوگی۔ نئی دلہن کی شرم و حیا اور چاؤ چونچلے، چند روز خوب چلتے ہیں، لیکن کب تک ؟ آخر ہر شئے کی ایک عمر ہوتی ہے، ناز برداریوں کا زمانہ ختم ہوا، اور ان کی جگہ خانہ داری کی ذمہ داری سر پڑی اور بڑھتی ہی گئی، اور ادھر اپنی آنکھیں بھی کھلتی گئیں، اور اندازہ ہوتا گیا کہ بیوی گل اندام و پری وش سہی، ہمیشہ بزم عشرت کی تصویر اور بستر کی تفریح ہی بن کر نہیں رہ سکتی، اسے گھر کی منتظمہ اور بچوں کی ماں ہو کر بھی رہنا ہے، اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ، اور اولاد کا سلسلہ شادی کے دوسرے سال ہی سے شروع ہو گیا تھا اور کم و بیش ۱۴ سال تک جاری رہا۔ یعنی بیوی کے عمر کے ۳۶ سال تک۔ کل چھ اولاد ہوئیں چار لڑکے اور دو لڑکیاں، الحمدللہ وہ سب زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو دین و دنیا کی سعادتوں سے سرفراز فرمائے (آمین)

۵۰ سال کی محبوبہ ! آج کہاں ہے اس کی وہ خوبی و زیبائی، رعنائی و شادابی ! لیکن گوہر عصمت سب سے بڑھ کر، سب سے مقدم اور سب سے فائق !

ترجمان حقیقت علامہ اقبال کہتے ہیں۔

میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایت غم عاشقی، تو حدیث ماتم دلبری

اور اکبر الہ آبادی جو مجاز و حقیقت کے جامع ہیں وہ کہتے ہیں :

حسن ہے بے وفا بھی فانی بھی
کاش کچھ اسے جوانی بھی

اور رقم لکھنوی رقمطراز ہیں :

ہے یہ حقیقت مجاز، اب یہ کھلا ہے جا کے راز
سب ہے فریب آب و گل، حسن و جمال کچھ نہیں

غرض وقت کی رفتار روک دینا کس بندے کے بس کی بات ہے ؟ سن و سال کے اثرات کو روک دینا کس کے اختیار میں ہے ؟ کہنگی کا نقش کون دھو سکا ہے ؟ زندگی برق رفتاری سے تبدیل ہوتی رہتی ہے، اور انسان غریب کے بس میں بجز حسرت و تمنا کے اور کیا ہے ؟ دعائیں بارہا کی ہیں کہ یہ رفیقۂ حیات اس عالم میں حور بن کر ملے، ایسی دعائیں اور مرادیں اہل جنت کو تو ضرور مل کر رہیں گی " **وفیھا ماتشتھیہ الأنفس وتلذا الأعین** " بلکہ اس سے زیادہ واضح بشارت " **لھم مایشاؤون فیھا ولدینا مزید** " بصراحت موجود ہے۔ہاں اپنا نصیبہ مغفورت کا ہونا چاہیئے۔خدایا ہماری مغفرت فرما۔

بیوی کی شکل و صورت کا سوال شادی کے چند سال گزر جانے پر کچھ زیادہ اہم نہیں رہ جاتا، ثانوی درجہ کا رہ جاتا ہے، فطرت کہنا چاہیئے کہ ہر جواں عورت کے چہرے پر ماء الشباب کا غازہ مل کر اسے مرد کے لئے قبول صورت بنا ہی دیتی ہے۔غرض زندگی کے نباہ میں صورت سے کہیں بڑھ کر سیرت کو اہمیت حاصل ہے۔اور سیرت کا مفہوم بڑا وسیع ہے " رہنے سہنے کے سارے ڈھنگ اور حسن معاشرت، کی ساری صورتیں اس کے اندر آگئیں، میاں بیوی کا سابقہ، دنیا کے سارے سابقوں سے نرالا، باہمی الفت و محبت جتنی بھی ہو یہ ناممکن ہے کہ روزانہ زندگی کی بے شمار جزئیات میں

دونوں کے سوچنے کا ڈھنگ بالکل ایک سا ہو۔

اختلاف مذاق تو لازمۂ بشریت ہے، اور پھر سابقہ اکثر صورتوں میں بیوی کو تنہا میاں سے نباہنا نہیں ہوتا، بلکہ سارے سسرال والوں اور سسرال والیوں سے نباہنا ہوتا ہے، ان میں بڑے بھی ہوتے ہیں اور چھوٹے بھی، عورتیں بھی اور مرد بھی، خود اپنی اولاد بھی۔ یہ امتحان دنیا کے سخت ترین امتحانوں میں سے ہے، بڑی قابل داد اور قابل تہنیت ہیں وہ بیویاں جو اس مرحلہ کو کامیابی سے طے کر لے جاتی ہیں۔

اپنی قسمت پر رشک کرنے، اور اپنے آپ کو مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے کہ اپنی رفیقۂ حیات، الحمدللہ، بحیثیت مجموعی اسی قسم کی نکلیں، اونچے گھر کی تھیں، بڑی مغرور ہوتیں، بڑی مسرف ہوتیں، بڑی تیز زبان ہوتیں، بڑی کاہل اور بڑی آرام طلب ہوتیں، مال و دولت کی حریص ہوتیں تو میں کیا کر لیتا؟ ہر وقت کے جھگڑے قضیوں سے زندگی اجیرن ہو جاتی۔ علمی اور قلمی مشغلوں کے لئے وقت اور سکون خاطر کہاں سے لاتا؟ شادی کے بعد عجیب و غریب مرحلے آئے، غربت و ناداری کے دن بیتے، اگر دلجمعی نہ ہوتی تو کیا آگے بڑھنے کی راہیں نکل آتیں، شادی کے بعد میں نے تابڑ توڑ کوئی آٹھ علمی ڈگریاں حاصل کیں، اگر سکون خاطر نہ ہوتا تو کیا میں امتحان پاس کرتا، اور وہ بھی ہر امتحان میں درجہ امتیاز لاتا، یہ سب باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ میری ازدواجی زندگی میں وہ میرے لئے رحمت بن کر رہیں، میری ناداری سے کبھی غمزدہ نہ ہوئیں۔ بلکہ ہر وقت وہ میرا دل بڑھاتیں اور کہتیں کہ "اللہ اچھے دن لائے گا" اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اچھے دن دکھلائے اور ہر طرح کی دینی و دنیوی ترقیوں سے سرفراز فرمایا۔

اللہ کا کتنا بڑا فضل و احسان ہے کہ اس نیک بیوی نے ان سارے خطروں میں اور زندگی کے ہر موقع پر میری سچی رفاقت نبھائی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ فرشتہ

خصلت ہیں ، بے زبان ہیں ، بے نفس ہیں ، کبھی بھی مجھے یا میرے گھر والوں کو ان سے اذیت نہیں پہنچی ، ایسے بے مزہ مبالغہ کے ڈانڈے جھوٹ سے مل جاتے ہیں ، اور عملی زندگی میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ، نرم و گرم حالات دنیا میں ساتھ چلتے ہیں ، پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں ، یہ اللہ کا احسان عظیم ہے کہ فی الجملہ اب تک جیسی گزری ، قابل صد شکر اور بہتوں کے لئے قابل رشک ہے ۔

والد مرحوم کی رحلت تو پہلے ہو چکی تھی ، باقی والدہ تھیں ، بہن تھیں بہنوئی تھے بھائی تھے ، بھاوجیں تھیں ، غرض رشتہ کے بڑے ، چھوٹے بہت سے تھے ۔

مسلمان گھرانے کی خاتون کو جنت جیت لینے کے لئے بہت زیادہ نفل نمازوں کی اور عبادتوں و ریاضتوں کی چنداں ضرورت ہی نہیں ، بس فرض نمازوں کے بعد بچوں کو ٹھیک طرح پرورش دے دینا ، اور اپنے والوں کے حق ادا کر کے ان کو راضی رکھنا ، یہ خود بہت بڑا مجاہدہ ہے ، یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ عابدہ ، زاہدہ ، تہجد گزار رہیں اور ہیں ، یہاں تک کہ عین جوانی میں جب وہ میرے پاس آئیں تو میں نے انھیں تہجد قضا کرتے نہ دیکھا ، اور رہے دنیا کے معاملات تو ان کا تذکرہ ابھی کر آیا ہوں ۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہے ، جو قدم قدم پر ہماری دستگیری فرماتا رہتا ہے ۔

جو کچھ کہ ہوا ، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ کہ ہوگا تیرے ہی کرم سے ہوگا

غوثؔ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

باب (۱۷)

ازدواجی زندگی (حصہ سوم)

یہ غلط فہمی ہرگز نہ ہونے پائے کہ یہ ۳۳ سالہ ازدواجی زندگی بس ہنستے کھیلتے بغیر کسی بے لطفی و ناگواری کے پیش آئے گزر گئی، ایسا ہونا اس آب و گل کی دنیا میں ممکن نہیں، اس عالم عنصری میں تو قدم قدم پر تصادم و مزاحمت رکھا ہوا ہے، عقل کا عقل سے، ذوق کا ذوق سے، نفس کا نفس سے تصادم و مزاحمت ضروری ہے، اور ہماری زندگی میں بھی ہوتا رہا۔ انسان عشق و محبت کے دعوے بہت کرتا ہے، لیکن وہ سب سے بڑا عاشق خود اپنے نفس کا ہوتا ہے، اپنی مرضی کو کسی کے تابع نہیں کرتا، کہیں اس کے خلاف مزاحمت ہوئی، سارے عشق و محبت کے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، طوفان غیظ و غضب سے مقابلہ کی قوت اگر کسی چیز میں ہے تو صرف خوف خدا میں ہے۔

مرد کے عقد ثانی کے لئے یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھ لیجئے کہ اس کے لئے ہرگز ضروری نہیں کہ اس کی تہہ میں پہلی بیوی سے کسی ناخوشی یا بیزاری کا، بلکہ بے رغبتی و بے التفاتی ہی کا کوئی جذبہ شامل ہو، محبت اور دل لگاؤ اور چیز ہے اور طبعی ضرورت بالکل دوسری چیز۔ غالب کا مطلع نری شاعری نہیں، ایک گہری نفسیاتی حقیقت کا ترجمان ہے۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تری صورت مگر ملے

فرماتے ہیں کہ راحت قلب جس شئے کا نام ہے وہ تو سوا تمہارے اور کسی سے ممکن نہیں، البتہ جسمانی رغبت اگر حور بہشت کی طرف ہو جائے تو یہی بہت ہے۔

بیوی کے طویل زمانہ حمل و مدت رضاعت کے باعث طبیعت ایک مدت سے ڈانواں ڈول رہا کرتی ،یہاں تک کہ ۱۹۷۶ء میں جب اپنی عمر ۳۶ سال کی تھی ، منتشر خیالات مرتکز ہو کر انوار العلوم کالج کی ایک دوشیزہ پر جم کر رہ گئے ۔اس سے رسم و راہ بڑھتی گئی ، اور محبت کا شعلہ بھڑک اٹھا ، اڑتے اڑاتے یہ خبر میری رفیقۂ حیات تک پہنچ گئی ،اب کیا تھا رونے پیٹنے لگیں ، ہمیشہ غم واندوہ میں رہتیں ، اور آنسو بہاتے رہتیں ، میں نے ہر طرح سمجھایا منایا ، لیکن وہ مجھ سے مطمئن نہ تھیں ، روزانہ کالج میں اس لڑکی کا سامنا ہوتا ، یہاں کی یہ ادائیں تھیں اور وہاں کی وہ صدائیں ، غرض دوسری شادی کا رنگ چڑھتا اترتا گیا اور جب بیوی کی صحت خراب ہونے لگی تو میں بہت گھبرایا ، روتے روتے گویا ان کا دامن تر رہتا ، ان کے رونے سے بچے بھی رونے لگے ، اور کبھی کبھی ان کا غصہ بچوں پر نکلنے لگا ، اور زندگی بے مزہ ہو کر رہ گئی ۔

غرض اس دوران جو جو حماقتیں میری بیوی کے ساتھ ہوئیں آج تک دل سے شرمندہ ہوں ، اور خدا سے مغفرت کا طالب ۔

میری محبوب بیوی کی اس پریشانی سے گویا میں سہم سا گیا ، اور جیسے میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ، گویا ع

اسد اب تو لینے کے دینے پڑے

خوش مزاجی اور زندہ دلی کی قدر ہو گئی ، ہر وقت وہ غم واندوہ میں رہتیں ، خود روتیں اور دوسروں کو رلاتیں ، میں نے مفکر اسلام استاذ محترم حضرت علی میاں ندوی مدظلہ کی خدمت میں فریاد کی ، جواب بڑا تشفی بخش آیا کہ تمہاری بیوی کی یہ ساری کیفیتیں کسی ضد یا مخالفت سے نہیں ، بلکہ وفور محبت سے پیدا ہوی ہیں ، ان کو آپ کے ساتھ اس درجہ محبت ہے کہ وہ اس کا تصور ہی نہیں کر سکتی تھیں کہ آپ کسی

اور کی محبت میں کسی درجہ میں بھی شریک ہوں ۔ ہفتہ دو ہفتہ نہیں مہینوں اس خانگی بے لطفی کے گزرے ۔

غرض دوسری بیوی کرنے کا نشہ سر سے اترا، اور سرد پڑتے پڑتے بالکل اتر گیا، یہ خانگی زندگی کی بدمزگی چند مہینوں میں ختم ہوی، اب وہ مجھ سے مطمئن تھیں، لیکن " دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے " ۔ کبھی اس طرح کی کوئی بھی بھنک کان میں پڑجائے ، یا کسی طرح کا کوئی بھی شک و شبہ کا واقعہ پیش آجائے تو تحقیق میں لگ جاتی ہیں ۔ لیکن رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت بھی اب سرد پڑتی جارہی ہے ۔ لیکن اب چڑھتے ہوے بڑھاپے نے ہم دونوں کو شیر و شکر کر دیا ہے ۔ خدا یہ محبت ہمیشہ قائم رکھے ۔ آمین

باب (۱۸)

ازدواجی زندگی (حصہ چہارم)

اپنی دل پسند بیوی مل جانا، دنیا کی بہت بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، جہاں جہاں میاں بیوی میں موافقت نہیں ہوتی زندگی ایک مستقل کوفت ہو کر رہ جاتی ہے ۔ بلکہ یوں کہیے کہ ہر وقت کی کشمکش اور ہمہ وقتی جھک جھک زندگی کو پنمونہ جہنم بنادیتی ہے ، جہاں تک افتاد مزاج اور مذاق طبیعت کا تعلق ہے ، پوری طرح کا توافق اب بھی ہم دونوں میں نہیں ، اور نہ ہی ایک دوسرے کی افتاد طبع پر ایک دوسرے کو ضد ہے ، لیکن اکثر چیزیں اللہ کے فضل سے ایسی جمع ہو گئیں کہ جنھوں نے اس خلا کو یہی نہیں کہ پر کر دیا ہے ، بلکہ زندگی میں ایک بڑی دلکش ہمواری اور مثبت زیبائی پیدا کر دی ہے ۔

غرض زندگی میں بڑے اتار چڑھاؤ آئے، لیکن محبت ہمیشہ قائم رہی۔ بعض مرتبہ نادانیاں دونوں طرف سے ہوتی رہیں، اس میں میری ہی نادانیاں زیادہ رہیں، جب کہ ہمارے خسر صاحب نے ہم کو عطا کردہ ایک قطعۂ اراضی ہمارے علم و اطلاع کے بغیر فروخت کر دی، اس واقعہ نے شدید ردعمل پیدا کیا، بیچاری وہ والدین کو اس معاملہ میں کیا کہہ سکتی تھیں، صبر کا پہاڑ بنی رہیں، ان کے والد ماجد کے کیئے کی سزا وہ پاتی رہیں، اس سلسلہ میں ہمارے اور ان کے ناعاقبت اندیشوں نے ہم کو خوب شہ دی اور بات کا بتنگڑ بنادیا، لیکن اس ابتلاء و آزمائش میں ہمارا ہی نقصان ہوا اور بیچاری کو بڑا ہی صدمہ پہنچا، اس وقت کے واقعات کو یاد کرتا ہوں تو بڑی ندامت ہوتی ہے اور شرم سے گردن جھک جاتی ہے۔ ان واقعات میں اللہ جانے ان کے ساتھ کتنی زیادتیاں ہوئیں اور نہ معلوم کتنوں کے حقوق ٹوٹے، اور کتنوں سے گستاخیاں ہوئیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف فرمائے، خسر محترم سے ایک بار اسی جائداد کے سلسلہ میں سخت کلامی ہوئی جس کا مجھے سخت افسوس ہے۔ خدائے تعالیٰ اس کو معاف فرمائے اور خسر محترم کے درجات بلند فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین!

دین کی خدمت تھوڑی بہت جو کچھ بھی بن پڑی، باہر والے اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ اس میں کتنا بڑا دخل اسی سکون قلب کا ہے، جو اپنی خانگی زندگی میں حاصل رہا۔ اگر یہ جمعیت خاطر نصیب نہ ہوتی، تو خدا معلوم کتنا وقت بک بک جھک جھک ہی کی نذر ہو جاتا، اور لکھنے پڑھنے اور پڑھانے کا شوق دھرے کا دھرا رہ جاتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اس ناچیز کی دینی خدمات کو کسی درجہ میں بھی شرف قبول عطا فرمایا تو اس میں ذرا شک نہیں کہ جس طرح زندگی کی ہر منزل میں وہ رفیق و شریک رہیں، اسی طرح اجر و صلہ میں بھی وہ برابر شریک رہیں گی۔

جہاں تک ان کا دینی پہلو ہے، وہ شادی سے قبل ہی عبادت گزار. اور فرائض کی سخت پابند تھیں، اور جب میرے پاس آئیں تو میں نے ان کو ہمیشہ عابدہ، زاہدہ، صائمہ پایا، نمازوں کی ہمیشہ سخت پابند رہیں اور یہی نہیں بلکہ تہجد، اشراق، چاشت تک ناغہ نہ ہونے دیتیں اور اللہ نے ہم کو جب دولت سے نوازا، تو سخاوت میں بھی وہ بہت آگے ہو گئیں۔

اور جہاں تک مالی اور معاشی پہلو ہے، اس میں انھیں ایک نیا سابقہ پڑا، انھیں امارت سے غربت کی طرف، خوشحالی سے تنگ حالی کی طرف (خصوصاً شروع کے چند سال میں) آنا پڑا، اور آفریں ہے کہ ہر سابقہ کو بغیر کسی بڑی اور سخت کش مکش کے نباہ لے گئیں۔

ان کی اطاعت کیشی رفاقت و ہمدمی کی پوری ایک داستان ہے، صرف دو ایک واقعے بہ طور مثال و نمونہ درج کر دینے کافی ہوں گے۔

۱) اپنے سسرال کی بگڑی ہوی بات جا کر انھوں نے بہت ہی کم بتائی، ورنہ عام طور سے تو یہی ہوتا ہے کہ عورتیں اپنے میکے جا کر اپنے شوہر کے غصہ گرمی یا تنگ دستی کا رونا... روتی ہیں، یا ساس نندوں کے شکوے کرتی ہیں، ان کی روش اس کے برعکس رہی، بحیثیت بشر مجھ میں بعض کمزوریاں تھیں اور ہیں، لیکن انھوں نے میرے غصہ، بدمزاجی کو نہیں بتایا اور اگر کبھی ضرورت ہوی تو ہلکا ہی کر کے دکھایا، اگر وہ یہ نہ کرتیں تو سسرال میں بے لطفی و رنجش رکھی ہوی تھی۔

۲) میں قدرے غصہ والا ہوں اور اب بزرگوں کی صحبت کے طفیل وہ مرض کم ہو گیا ہے، لیکن بالکل نہیں گیا، جوانی میں اسی غصہ کے سبب ان پر میری طرف سے بعض زیادتیاں ہویں (اور کبھی کبھی اب بھی ہوتی ہیں) لیکن یہ نیک

خاتون صبر کا پہاڑ بنی ہوی رہیں ، اور کبھی بھی اپنوں اور غیروں میں حرف شکایت تک زبان پر نہ لائیں ۔اس ظرف کی مثال ملنا بھی آسان نہیں ۔

یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کے ہاں بلاوے کا پروانہ ہم دونوں میں سے پہلے کس کو اور کب ملتا ہے ، اور دونوں میں سے آگے پیچھے کس کو جانا ہے ۔اگر کہیں ان کا بلاوا پہلے آگیا تو زندگی بھر ان کی یاد تڑپاتی رہے گی ، اور اگر کہیں یہ پیچھے رہ گئیں ، تو عمر بھر روتے ہی گزار دیں گی ، بعض صدمے بعض اولاد کی طرف سے ایسے پڑے ہیں کہ کبھی وہ سہمی سہمی سی رہتی ہیں ، ان کے ناز بردار والد اور والدہ دنیا سے اٹھ چکے ہیں ، بھائی بہن ہزاروں میل دور (ہند) میں ہیں ، اور یہ امریکہ میں ، اولاد کے ہوتے ہوے بھی اپنے آپ کو کبھی کبھی تنہا اور بے سہارا محسوس کرنے لگی ہیں ، میرے بعد گھر میں وہ تنہائی محسوس کریں گی ۔اللہ تعالیٰ ان حالات میں اپنی رحمت کاملہ سے ان کی مدد فرمائے ۔آمین !

عقلی و دینی حیثیت سے سوچئے ، تو موت ہر مومن و مومنہ کے حق میں نعمت و رحمت ہی ہے ۔لیکن کمزور اعصاب ، کمزور دل اور کمزور دماغ والا انسان ، جذبات کا پتلا ہوتا ہے ، وہ مفارقت کی تاب کہاں لاسکتا ہے ۔اس عالم میں پہنچ کر دنیوی نعمتوں میں مجھے تو سب سے زیادہ انھیں کی یاد ستائے گی ۔والد ماجد اور والدہ ماجدہ کا ذکر قصداً نہیں کرتا ، کہ دونوں ان شاء اللہ اپنے حق و استحقاق سے وہاں موجود ہی ملیں گے ۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم دونوں کو صحت جسمانی و روحانی کے ساتھ رکھے ، اور جب بلاوا آوے تو ایمان و اسلام کی حالت میں آوے ، اور صالحین کے ساتھ حشر ہو ۔ آمین !

اللھم توفنا مسلمین وألحقنا بالصالحین ۔آمین

باب (۱۹)

امریکہ آنے کا دعوت نامہ

۱۹۸۰ء مطابق ۱۴۰۱ھ میں ایک حافظ القرآن کے تراویح سنانے کے لئے حضرت استاذ محترم قاری ڈاکٹر سید کلیم اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام ایک تار ملا، حضرت نے فوری مجھے طلب فرمایا اور تار کے ذریعہ امریکہ جانے کے اطلاع دینے کا حکم فرمایا، میں نے جناب محمد اعظم قریشی صاحب صدر اسلامک سوسائٹی (ORANGE COUNTY) کیلیفورنیا امریکہ کو تار سے مطلع کیا، انھوں نے ویزا کے کاغذات روانہ فرمائے، کاغذات ملنے کے دوسرے دن مدراس پہنچا، ویزا فوری مل گیا، اور جانے کے سارے انتظامات اللہ کے فضل سے ہوگئے اور میں ۳۰/ شعبان ۱۴۰۱ھ لاس اینجلس پہنچ گیا، جہاں سے یہ سوسائٹی ۳۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

الحمدللہ رمضان میں، میں نے تراویح میں قرآن پاک سنایا، اور مزید ایک ماہ یہیں اسلامک سوسائٹی میں بچوں کو پڑھاتا رہا، پھر شکاگو کلیولینڈ، بفالو، نیاگرا فال سے ہوتا ہوا نیویارک پہنچا اور وہاں سے لندن، اس طرح ذوالقعدہ کی ۲۰/ تاریخ ۱۴۰۱ھ کو بمبئی واپس لوٹا، آنے سے قبل حیدرآباد بذریعہ فون اپنی بیوی کو مطلع کر چکا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ بمبئی پہنچ جائیں۔ کیونکہ اسلامک سوسائٹی سے بفضل خدا حج بیت اللہ کی سعادت کے لئے ایک گرانقدر "ھدیہ" عطا کیا گیا تھا، اس طرح میں حج کی تمنا کو ساتھ لئے ہوئے بمبئی پہنچا۔

حج بیت اللہ وزیارت مدینہ منورہ کی سعادت
اور اس سلسلہ کی غائبانہ تائید

بمبئی میں میرا قیام ایک ندوی ساتھی کے پاس تھا، ان کے والد صاحب حاجیوں کی کوئی پچاس سال سے خدمت کی سعادت حاصل کر رہے تھے، میں نے ان سے حج بیت اللہ جانے کی تفصیل پوچھی، اور کہا کہ میں امسال حج بیت اللہ جانے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے پوچھا کیا آپ نے قرعہ میں اپنا نام دیا ہے، اور چار ماہ قبل درخواست اور روانگی کی فیس حکومت کے حوالے کی ہے؟ میں نے کہا کہ ان سب چیزوں میں سے میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ تو فرمایا کہ آپ حج کو نہیں جاسکتے، میں قدرے ناامید سا ہو گیا، ناشتہ کے بعد دو رکعت صلاۃ الحاجۃ پڑھی اور اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگی، اور اپنی اہلیہ کو لے کر حج آفس جانے لگا تو اسی میزبان بزرگ نے فرمایا کہ کہاں کے ارادے ہیں؟ میں نے کہا حج آفس، مسکراتے ہوئے فرمایا کہ تم وقت ضائع کر رہے ہو، میں نے پراز امید ان سے کہا کہ میں وہاں جاؤں گا اور ان شاء اللہ آتے وقت حج جانے کا پروانہ اور ہوائی ٹکٹ ساتھ لاؤں گا، انھوں نے کہا، اللہ آپ کی مدد کرے۔

جوں ہی میں حج آفس بمبئی پہنچا، وہاں مجھ کو ایک فرشتۂ غیب مل گیا، ان کا نام عبداللہ تھا۔ کہنے لگے، کیسے آنا ہوا؟ میں نے مدعا ظاہر کیا، وہ اندر جاکر کسی صاحب سے بات چیت کے بعد واپس آئے، اور فرمایا کہ آج حج آفس کی کارکردگی کا آخری دن ہے ناظم صاحب آج ۵ بجے واپس دہلی جارہے ہیں، سنا ہے کہ صرف ایک جہاز جانا باقی ہے۔ یکم ذوالحجہ ۱۴۰۱ھ کو اس کی پرواز ہے اور اس آخری جہاز میں صرف ۳ نشستیں باقی رہ گئی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ امیدواروں میں پانچ ہزار

آدمیوں کی لسٹ (List) ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم دونوں (میاں بیوی) کو ناظم صاحب سے ملاقات کی اجازت دلوا دیجئے، انھوں نے اس کا انتظام کیا، ۱۱ بجے دن کا وقت تھا کہ ہم دونوں ان کے اجلاس پر پہنچے، انھوں نے نہایت اخلاق سے بٹھایا، اور پوچھا کہ کس طرح تشریف لانا ہوا، تو میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے ساری تفصیل بتلائی اور ان سے گزارش کی کہ ہم دونوں کے حج بیت اللہ کے سلسلہ میں نظم فرمایا جائے، تو کہنے لگے کہ غالباً آپ کو یہاں کی " Farmalities " نہیں معلوم، میں نے کہا معلوم ہے لیکن اللہ نے آپ کو حاکم بنایا ہے، اور آپ اگر چاہیں تو اپنے اختیار تمیزی سے یہ نظم فرما سکتے ہیں۔ اور ہم دونوں آپ کے حق میں دعا گو ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ہماری اس حج کی سعادت کی قبولیت کی بات ڈال دی۔ فوراً منشی صاحب کو بلوایا، اور کہا کہ " یہ مولانا غوث ندوی صاحب اور ان کی اہلیہ کے لئے ۳ گھنٹے میں حج کی ساری انتظامی کارروائی مکمل کر دیں، میں ٹھیک ۳ بجے آفس میں رہوں گا اور اس وقت میری دستخط سارے کاغذات پر کروالیں " ہم شکریہ کے ساتھ انتظامات میں لگ گئے، جو اہم چیزیں ہم کو کرنی تھیں وہ یہ تھیں۔(۱) پاسپورٹ، وہ تو موجود ہی تھے۔(۲) امریکن ڈالر کا بھنانا۔(۳) کسی ڈاکٹر سے ضروری ٹیکے۔(۴) کسی کونسلر سے اخلاقی صداقت نامہ۔(۵) اور ٹکٹ کی خریدی، یہ ساری چیزیں ۳ گھنٹے میں کرنا ضروری تھا۔ اللہ ان عبداللہ صاحب کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے یہ سارے مرحلے تین گھنٹوں کے پہلے ہی کروا دیئے، اور ٹھیک تین بجے دن حج آفس کے ناظم صاحب (جو مولانا ابوالکلام آزاد کے بھانجے تھے) نے اپنی دستخط ثبت فرمادی، اور فرمایا کہ یہ ضروری کاغذات آپ کو حیدرآباد کے پتہ پر روانہ کئے جائیں گے جو کل صبح آپ کو مل جائیں گے، ہم ان کو دلی دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئے، اور اسی شام کی ٹرین سے حیدرآباد روانہ ہوئے، اور دوسرے دن صبح حیدرآباد پہنچے، ہم ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ پوسٹ مین کی آواز آئی اور جب پوسٹ کھولا تو حج کے سارے ضروری

کاغذات موجود تھے۔ الحمد للہ علیٰ ذلک۔

اللہ اللہ! رب العزت کی کیا کیا عنایات ہیں کہ وہ اپنی قدرت کاملہ دکھاتے رہتے ہیں، اور "انہونی" کو "ہونی" بناتے ہیں۔ اب ہم کو اپنے احباب سے مل کر ۲۹/ ذوالقعدہ ۱۴۰۱ھ تک بمبئی پہنچنا تھا، ایک ہفتہ قیام کے بعد، ہم واپس بمبئی آئے اور یکم ذوالحجہ ۱۴۰۱ھ کی صبح، جدہ کے لئے روانہ ہوگئے۔

باب (۲۰)

حج بیت اللہ

ہمارا ہوائی جہاز یکم ذوالحجہ ۱۴۰۱ھ کو جدہ پہونچا، دوسرے دن مکہ مکرمہ بذریعہ بس پہنچے، راستہ بھر دیکھتے رہے کہ بے سبزہ زمین کا ایک فرش ہے اور چاروں طرف جلے ہوئے پہاڑ کھڑے ہیں۔ بقول حفیظ جالندھری:

نہ اس میں گھاس اگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

مکۃ المکرمۃ جوں جوں قریب آتا گیا دل کی کیفیت بدلتی گئی، یہ ایسی سعادت تھی جو محض فضل خداوندی ہی سے حاصل ہو سکتی تھی، ورنہ ہم میں یہ قدرت کہاں تھی کہ اس دنیا کے سب سے مقدس ترین جگہوں پر پہنچتے:

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

مکہ مکرمہ

مکۃ المکرمۃ پہنچ کر سب سے پہلے ہم نے عمرہ کیا، طبیعت میں ایک وارفتگی تھی، طواف کے ہر چکر پر حجر اسود کا بوسہ لیتے ہوئے اور خدا کی عظمت و محبت کے خیال میں چکر لگاتے رہے۔ غرض جب طواف ختم ہوا، تو مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھی، پھر زم زم پانی کو خوب سیر ہو کر پیا، اس کے بعد صفا و مروہ کی سعی کی، اور بال منڈوا کر عمرہ پورا کیا۔

۸/ ذوالحجہ کو نیا احرام باندھا اور اپنی بیوی کے ساتھ منیٰ پیدل روانہ ہوئے، دوسرے دن عرفہ پیدل پہنچے، اور اسی رات مزدلفہ پاپیادہ گئے، اور دوسرے دن صبح منیٰ پیدل آئے، پھر منیٰ کے واجبات پورے کر کے بعد مغرب طواف افاضہ کیا، اور عشاء کے بعد پھر منیٰ واپس آئے، اس طرح ۱۲/ ذوالحجہ کے زوال کے بعد مکۃ المکرمۃ واپس آئے۔ حج کے بعد تقریباً مزید ۱۸ دن مکۃ المکرمۃ ہی میں قیام رہا، اور بیت اللہ کی عبادتوں کی سعادت نصیب ہوتی رہی۔

مدینہ منورہ

یکم محرم ۱۴۰۲ھ کو شوق کے پیروں سے دوڑ کر نہیں، شوق کے پروں سے اڑ کر مدینہ منورہ پہنچے، اور جب گنبد خضراء پر نظر پڑی تو ہماری زبان، ہمارے دلی احساسات کے اظہار سے قاصر رہی، جس طرح آج قلم قاصر ہے، ہم نے عاشقوں کی زبان میں دل کی دھڑکن اور آنسوؤں کی بارش کے ساتھ باتیں کیں، کیوں ہمارے دل نہ دھڑکتے! اور کیوں نہ ہمارے آنسو بہتے! ہم اب دیار حبیب میں پہنچے تھے، وہ دیار جس کے تصور میں ہم جیا کرتے تھے، اور جس کی یاد ہماری غذا تھی، سیرت پاک پڑھتے ہوئے، ان مقامات کے ذکر پر ہم محسوس کرتے تھے کہ یہ ہماری روح کا نشیمن

اور ہمارے دل کا مسکن ہے، ہمارا ملک جس میں ہم پیدا ہوے، وہ صرف ہمارے جسموں کا وطن تھا، اور ایسا کب ہوا کہ انسان کو اس کے جسم کا وطن دل کے وطن سے زیادہ عزیز ہو ؟ غرض ہم نے مسجد نبوی میں دو رکعت نماز پڑھی اور اس سعادت عظمیٰ کے نصیب ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا، پھر روضۂ مبارکہ کی طرف آئے، جو اس زمین میں جنت کا ایک ٹکڑا ہے، اور اس حجرۂ مبارک پر حاضری دی جس کو مرقد مبارک ہونے کا شرف حاصل ہے، جو قیامت تک کے لئے بند کر دیا گیا ہے، پھر ہم پورے ادب و احترام کے ساتھ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہوے اور کہا "**الصلاۃ والسلام علیک یاسیدی یارسول اللہ**"۔ اس کے بعد ہم نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ درود و سلام کے بعد جنۃ البقیع کی طرف روانہ ہوے، یہ زمین کا ایک قطعہ ہے، جہاں صدق و صفا اور مہر و وفا کا انمول خزانہ دفن ہے۔ ع

دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

وہاں پہنچ کر اہل قبور پر ہم نے سلام عرض کیا اور بار بار سلام عرض کرتے رہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر جبل احد کی طرف گئے، احد وہ پاک اور دلکش سرزمین ہے جہاں محبت و وفاداری کا سب سے دلکش منظر دیکھنے میں آیا، اسی میدان میں انسانی تاریخ نے ایمان و یقین کو جیتے جاگتے کرداروں کی شکل میں دیکھا، یہیں سے بہادری اور شجاعت کے الفاظ لغت کو میسر ہوے، اسی خطہ نے پاک محبت اور نادر دوستی کا نمونہ دنیا کو دکھایا، غزوۂ احد کی وہ پوری داستان سامنے آگئی، جہاں صحابہ نے جنت کی خوشبو سونگھی، حضرت ابو دجانہؓ نے آنحضرتؐ کی حفاظت میں اپنی پشت کو ڈھال بنایا، اور ان کی پشت تیروں سے چھلنی ہو گئی، سید الشہداء حضرت حمزہؓ نے بہادری سے یہیں شہادت پائی۔ اور ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے گئے۔ غرض ۷۰ صحابہؓ نے

یہاں بہادری کے ساتھ شہادت عظمیٰ پائی۔

اے کاش ! احد دنیا والوں کو اپنے اس محبت کے خزانہ سے کچھ دے دیتا، کاش آج دنیا کو اس پگھلے ایمان اور یقین کا کوئی ذرہ بھی نصیب ہوجاتا، اگر ایسا ہوجائے تو اس دنیا کی قسمت بدل جائے اور یہ دنیا جنت بن جائے۔ ہم نے شہدا۔ کرام کی خدمت میں رو رو کر سلام عرض کیا، اور اللہ سے ان پر رحمتوں کی بارش کی درخواست کی پھر یہاں سے مسجد قبا پہنچے اور دو رکعت نماز ادا کی اور " **لمسجدٌ اُسس علی التقویٰ** " کی آیت کو بار بار پڑھتے ہوئے ان اصحاب صدق و صفا، و مہر و وفا کو یاد کیا، اور ان کے درجات کی بلندی کی دعا مانگی۔ مدینہ منورہ میں ہمارا قیام ۱۴ دن رہا، یہاں کی برکات و ثمرات کو صبح و مساء لوٹتے رہے اور شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم پر الوداعی سلام کے ساتھ جدہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ یہ پہلی حاضری کے وہ احساسات ہیں جن کو ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔

اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ ۱۴۰۱ھ کے اس پہلے حج و عمرہ کے بعد اللہ نے کئی بار اور بار بار حج و زیارت کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ اور عمرہ کی بھی سعادت کئی بار نصیب ہوچکی ہے اور دعا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہم کو بار بار وہاں بلوائے اور دارین کی سعادت نصیب فرمائے اور مدینہ منورہ میں ایمان کی موت نصیب ہو۔ آمین

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

اس طرح ۱۵/ محرم الحرام ۱۴۰۲ھ کو ہم جدہ سے بمبئی روانہ ہوئے، اور دوسرے دن الحمدللہ حیدرآباد پہنچے۔

جو کچھ کہ ہوا ، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ کہ ہوگا ، تیرے ہی کرم سے ہوگا
عوض کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

حجاز مقدس میں دوبارہ حاضری

۱۴۰۱ھ کے حج کے بعد میں ہندوستان واپس آیا ، دو ماہ بعد جامعۃ الملک عبدالعزیز جدہ سے " محاضرات " کے لئے دعوت نامہ ملا ، تین ماہ قیام کے بعد پھر ہندوستان پہنچا تو امریکہ سے مستقل ملازمت کا دعوت نامہ آیا ہوا تھا ، اب میرے سامنے بیک وقت ۴ ملازمتیں تھیں ، (۱) کلیۃ القرآن " جامعہ اسلامیہ " مدینہ منورہ میں نائب پروفیسر کی جائداد ۔ (۲) جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ریڈر شپ کی جائداد ۔ (۳) امریکہ میں " جماعت اسلام " کی ڈار کٹری (نظامت) اور امامت اور (۴) قدیم آٹھ سالہ ملازمت لکچرار و صدر شعبہ عربی انوار العلوم ڈگری کالج ۔ حیدرآباد کے بزرگوں سے مشورہ کے بعد حضرت استاذ محترم مولانا علی میاں صاحب مدظلہ سے رجوع ہوا ، حضرت محترم نے امریکہ میں دینی خدمت کو ترجیح دینے کی ہدایت کی ، اس طرح امریکہ جانے کا قصد کیا ۔

باب (۲۱)

امریکہ کو دوبارہ روانگی

اب میں نے امریکہ مطلع کیا کہ میں اس خدمت کو قبول کرنے تیار ہوں ، پھر ویزا کے لئے مدراس امریکن قونصل خانہ رجوع ہوا ، تیسرے دن مجھے اور میری بیوی

اور سارے بچوں کا ویزا مل گیا اور اب بحیثیت (IMMIGRANT) مہاجر، امریکہ اہل و عیال کے ساتھ پہنچا۔ یہ ۳۰/ جولائی ۱۹۸۱ء کی تاریخ تھی۔ جماعت اسلام اینجل وڈ لاس اینجلس میں، میں نے یہ دینی خدمت تقریباً سات سال بحسن و خوبی انجام دی، اور اس اسلامک سوسائٹی کو اللہ کے فضل و کرم سے ترقی سے ہمکنار کیا، بچوں اور بڑوں کی تعلیم کا عمدہ نظم کیا، اور پوری دلجمعی کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیتا رہا۔ اور ۱۵/ اپریل ۱۹۸۸ء کو دار العلوم کے قیام کے سلسلہ میں، اس خدمت سے از خود مستعفی ہوا۔

دار العلوم الاسلامیہ بامریکا

۱۹۸۷ء کے وسط میں دار العلوم الاسلامیہ کے قیام کا خیال پیدا ہوا، استخارہ کے بعد اس ادارہ کے قیام کی کوشش میں لگ گیا، اور الحمد للہ اس کے قیام کی صورتیں غیب سے فراہم ہونے لگیں، اللہ تعالیٰ کا میں شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ ناکارہ کو اس بات کی توفیق دی کہ امریکہ میں "دار العلوم" قائم کیا جائے جو امریکہ کا سب سے پہلا دار العلوم ہے۔ ۱۴/ جون ۱۹۸۷ء کو اس ادارہ کا رجسٹریشن عمل میں آیا، اور ۱۹۸۸ء کے اوائل میں باضابطہ ادارہ کی تعمیر اور مستقل دینی تعلیم کا خیال موجزن ہوا، یکم فروری ۱۹۸۸ء کے اوائل میں "جماعت اسلام" کے ذمہ داروں کو اس کی اطلاع دی، کہ میں جماعت اسلام کی خدمت کے ساتھ ساتھ ایک ادارہ کے مستقل قیام کا ارادہ رکھتا ہوں، جماعت اسلام کے ذمہ داروں کی طرف سے اس کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار ہوا اور ۱۴/ فروری ۱۹۸۸ء کو انھوں نے ایک میٹنگ بلوائی اور اس میں یہ طے کیا کہ جماعت اسلام کی خدمت کے ساتھ ساتھ ادارہ کی خدمت کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ تو میں نے ۱۵/ فروری ۱۹۸۸ء کو اپنا استعفا پیش کر دیا کہ، آج سے دو ماہ بعد یعنی ۱۵/ اپریل ۱۹۸۸ء سے میں اپنی اس خدمت سے مستعفی ہوتا ہوں۔ جماعت

اسلام نے بادل ناخواستہ اس استعفا کو قبول کر لیا۔ اور بقول اکبر الہ آبادی :

یہی ٹھیری جو شرط وصل لیلیٰ
تو استعفا مرا باحسرت و یاس

باب (۲۲)

دارالعلوم الاسلامیہ بأمریکا کے قیام کی مستقلاً کوشش

۱۵/ اپریل ۱۹۸۸ء سے ، جماعت اسلام سے مستعفی ہونے کے بعد مستقلاً دارالعلوم کے قیام میں مصروف ہو گیا، الحمدللہ آٹھ ماہ کی جدوجہد میں بفضل خدا سات ایکڑ زمین ادارہ کے لئے خریدی گئی ، اور مدرسہ اور مسجد کی تعمیر کی کوشش جاری رہی ، الحمدللہ مزید چھ ماہ میں اس تعمیر کا سامان اللہ تعالیٰ نے غیب سے عطا فرمایا، کچھ مخیر دوست احباب اس کام کے لئے کھڑے ہو گئے اور اپنی گرانقدر رقم اس کام کے لئے پیش کی ، تعمیر کے مراحل جو حکومت سے وابستہ تھے چند ماہ میں طے پا گئے ، اور یکم اگست ۱۹۸۹ء سے دارالعلوم کا تعمیری کام شروع ہو گیا ، ہمارے ایک دوست قاضی محمد یوسف صاحب انجنیر نے تعمیری ذمہ داری اعزازی طور پر قبول فرمائی ، سب سے پہلے دارالعلوم کی بنیاد کے لئے میرے دوست جناب عبدالرحمن میمن صاحب سامنے آئے ، اس کے بعد جناب عبدالرؤوف غازیانی صاحب تاجر نے مزید تعمیر کے لئے ایک گرانقدر رقم عطا کی ، اس طرح آدھی تعمیر مکمل ہو گئی ، اب ابوبکر وکیل ، امین لاکھانی اور ان کے بڑے بھائی اشرف لاکھانی نے مزید رقم فراہم کی ، تقریباً دو تہائی کام ایک سال میں مکمل ہو گیا ، اب اس تعمیر کی تکمیل کے لئے مزید ڈیڑھ لاکھ ڈالر کی ضرورت تھی ، میں نے اپنے دوست احباب اور شاگردوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے دارالعلوم کی اہمیت پر تقریر کی ، تو اللہ تعالیٰ نے کچھ اصحاب خیر کو اس کی تکمیل کی توفیق

دی ، ہم اللہ تعالیٰ سے ان سب کے لئے ان کے اس گرانقدر تعاون پر دعا کرتے ہیں ، پروردگار ! تو ان سب کو جنھوں نے دار العلوم کی داے ، درے ، سخنے خدمت انجام دی ہے ، جزائے خیر دے اور ان کی خدمت کو شرف قبولیت سے سرفراز فرما ۔ دار العلوم کے قیام کے سلسلہ میں جناب محمد اقبال صاحب کا تعاون برابر ساتھ رہا اور اب تک الحمد للہ قائم ہے ۔ اور جناب ابو بکر بیٹھا والا صاحب کی انتھک کوشش اور مخیر احباب سے تعارف نے اس کام میں بیحد مدد کی ، اللہ ان دونوں کو اپنی شان کے مطابق اجر عطا فرمائے ۔ آمین !

غرض دار العلوم کی تعمیر ۲۸/ فبروری ۱۹۹۱ء کو مکمل ہوی ، اور یکم مارچ ۱۹۹۱ء کو اس کا افتتاح حضرت الاستاذ مولانا محمد عبد الستار خاں صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ کے ہاتھوں عمل میں آیا ، اور اسی دن سے دینی تعلیم کا آغاز ہو گیا ۔ **الحمد للہ علیٰ ذلک** ۔

الحمد للہ اس ادارہ میں ابتدائی دینی تعلیم شروع ہو چکی ہے ، جس میں ناظرہ قرآن پاک تجوید سے پڑھایا جاتا ہے ، اسلام کی بنیادی تعلیم توحید رسالت ، نماز ، روزہ ، حج زکاۃ کی تعلیم کا عمدہ نظم ہے ، سیرت طیبہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور سیرت صحابہ و صحابیات کی تعلیم ہوتی ہے ، اس کے علاوہ نماز کی دعائیں اور ۲۰ سورتیں حفظ کرائی جاتی ہیں ، اور ۴۰ احادیث زبانی ترجمہ کے ساتھ یاد دلائی جاتی ہیں ۔ دار العلوم کا مستقل ایک نصاب ہے ، جس کو سامنے رکھ کر تعلیم دی جاتی ہے ۔ ان علوم کے علاوہ ایک مستقل شعبۂ حفظ ہے ، جس میں اس وقت ۷ طلبا ۔ اور ۴ طالبات حفظ کر رہی ہیں ۔ مدرسہ کی مسجد میں پنجوقتہ نماز باجماعت کا اہتمام ہے اور جمعہ و عیدین کی نمازوں میں سینکڑوں مسلمان شریک ہوتے ہیں ۔ اور گاہ گاہ مختلف عنوانوں پر جلسوں و سمینار کا انعقاد ہوتا ہے ، جس میں نامی گرامی علماء کو بلوایا جاتا ہے ، اور

ہزاروں مسلمان ان کے مواعظ سے مستفید ہوتے ہیں ۔ ان کے علاوہ الحمدللہ سینکڑوں امریکیوں نے دارالعلوم میں آکر اسلام قبول کیا ہے ۔ **الحمدللہ رب العالمین ۔**

۱۹۹۳ء میں دارالعلوم کا ایک ماسٹر پلان بنوایا گیا تھا، جس میں ایک مستقل جامعہ اور دارالاقامہ کی تعمیر کا پلان تیار کیا گیا، اور حکومت نے اس کی منظوری بھی دے دی ہے، سب سے پہلے ایک عظیم دارالاقامہ کا پروگرام بنایا گیا، اور اب اس کا نقشہ تیار کیا جاکر منظوری بھی حاصل کی جاچکی ہے، لیکن گزشتہ دو سال سے اس کی تعمیر کی صورت نہیں بن پڑ رہی ہے، دارالاقامہ (Dormitory) کی تعمیر کے لئے 500000/= امریکن ڈالر کی ضرورت ہے، لیکن موجودہ امریکی معاشی بحران کی وجہ سے تعمیر کی فی الوقت کوئی صورت ممکن نہیں ہورہی ہے ۔ اللہ تعالیٰ آسان فرمائے، اور غیب سے سامان فرمائے ۔ آمین !

۱۹۹۵ء میں حفظ القرآن کے طلباء کے لئے دارالعلوم سے ملحقہ ایک بڑا مکان پانچ کمروں والا خریدا گیا، جس کی کامل اراضی ایک ایکڑ ہے، لیکن حکومت امریکہ نے اس میں بچوں کے قیام کی اجازت نہیں دی کہ یہ ان کے (DORMITORY) دارالاقامہ کے معیار پر پورا نہیں اترتا ۔

غرض دارالعلوم کے دارالاقامہ (Dormitory) کی تعمیری منظوری ۲۲/ نومبر ۱۹۹۶ء کو ختم ہورہی ہے ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس دارالاقامہ کی تعمیر کا سامان غیب سے اور اپنے خصوصی فضل سے مکمل فرمادے ۔

جو کچھ کہ ہوا ، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ کہ ہوگا ، تیرے ہی کرم سے ہوگا

. . . .

الحمدللہ دارالعلوم میں فی الوقت روزانہ ہفتہ میں ۵ دن تعلیم کا نظم ہے۔ منگل تا جمعہ، شام ۵ بجے سے ساڑھے سات بجے تک، اور سنیچر کے دن ۱۰ بجے سے ایک بجے تک۔ طلباء کی تعداد تقریباً ستر ہے۔ طلباء فارغ ہوکر جاتے ہیں، اور نئے طلباء آتے رہتے ہیں۔ ۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۶ء اس ادارہ کے فارغین طلباء کی تعداد تقریباً ۱۰۰ ہے اور شعبۂ حفظ میں بعض طلباء ۱۵، ۱۲، ۷، ۵، ۲ پارے حفظ کرچکے ہیں، اور ان کے حفظ کا سلسلہ جاری ہے، کیونکہ دارالاقامہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ طلباء روزانہ تعلیم کو بوجہ مسافت نہیں آسکتے، اس لئے بعض طلباء ہفتہ میں ایک دن بعض دو دن، اور بعض تین دن، حفظ القرآن کی تعلیم کے لئے آتے ہیں۔ اگر دارالاقامہ تعمیر ہوجائے تو مستقل تعلیم کی صورت ممکن ہے، خدا کرے کہ اس کی تعمیر جلد ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ پروردگار! اپنے فضل و کرم سے اس تعمیری کام کو مکمل فرمادے۔ اور دارالعلوم کی حفاظت تاقیام قیامت فرمادے۔ اور حساد و اشرار کے شر و فساد سے اس کو محفوظ رکھے۔ آمین

باب (۲۳)

تحریر و تقریر

تحریر : تحریر اور تقریر کا صحیح سلیقہ تو میں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی میں سیکھا لیکن شدید عمر کے ۱۵ سال سے ہوگئی تھی، تحریر کا عملی اثر ندوۃ العلماء کے طالب علمی سے شروع ہوا اور فراغت کے بعد میں نے باضابطہ جم کر اس پر کام کیا، اور دائرۃ المعارف العثمانیہ کی خدمت نے اس فن کو جلادی، لیکن میری زیادہ تحریریں عربی زبان میں ہیں، اردو میں کم ہیں، جس کی تفصیل وقت پر آجائے گی۔

تقریر : تقریر کا سلسلہ ۱۵ سال کی عمر سے خطبات جمعہ سے شروع ہوتا ہے، ندوی ہونے سے پہلے کی تقریریں آئیں بائیں شائیں (یعنی عامیانہ) تھیں اور ندوہ سے فراغت کے بعد سینکڑوں بار تقریر کرنے کا موقعہ ملا۔ تقریریں زیادہ تر سنجیدہ ہوتیں، لیکن اگر تقریر کسی کے جواب میں ہو یا اسلام کے دفاع میں ہو تو جوشیلی ہوتی اور مجمع کو خوب گرماتی، جوانی کی تقاریر میں غضب کا جوش تھا، تاہم اس عمر میں بھی وہ جوش تھما نہیں ہے، لیکن جوش میں اکثر ہوش کو قائم رکھا جاتا رہا، کبھی کبھی جوشیلی تقریر میں بے ہوشی کی وجہ بعض وقت شرمندگی اٹھانی پڑی۔

گزشتہ عراق پر امریکہ کی چڑھائی کے موقع پر میں نے دل کھول کر امریکہ اور سعودی عرب پر تقریروں میں سخت تنقیدیں کیں، اور اس موقع پر شرعی نقطۂ نظر بتاتے ہوئے حکومت سعودیہ کو خوب جھنجھوڑا۔ اور امریکہ کی غلط پالیسی اور اسلام دشمنی پر شدید نکتہ چینی کی۔ لیکن ساتھ ساتھ صدام حسین کو بھی نہیں بخشا، اس ظالم کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کی وجہ سے مغربی ممالک نے خوب فائدہ اٹھایا، اور مسلم ممالک کو خوب بیوقوف بنایا اور ان کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں سے مسلمانوں کے وقار کو صدمہ پہنچا۔ مشرق وسطی کی جنگ پر میرا سب سے بڑا اعتراض جو تھا اور ہے، وہ یہ کہ "صدام حسین" کے شخصی استبداد کی سزا امریکہ اور مشرق وسطی کے مسلم ممالک نے عراقی معصوم عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو کیوں دی اور اب تک دے رہے ہیں اور خود ظالم صدام اور اس کے قریبی حلقوں کو کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔؟ غرض اگر تقاریر کو ضبط تحریر میں لایا جاتا تو بیسیوں مضامین کتابی شکل میں آسکتے تھے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

تقریریں میں نے تینوں زبانوں (اردو، عربی اور انگریزی) میں کی ہیں اور کرتا آرہا ہوں، اور گزشتہ ۱۵ سالوں میں زیادہ تقریریں انگریزی ہی میں ہوئیں اور اب بھی اسی میں زیادہ ہوتی ہیں۔ پورے سال میں تین چار بار سے زیادہ اردو میں نہیں

ہو پاتیں، اور وہ بھی سیرت کے بعض اہم جلسوں میں۔ عربی تقاریر جمعہ کے خطبات میں اکثر کسی عنوان پر قرآن و حدیث کی روشنی میں، ہر جمعہ کو کرتا ہوں۔ اور کبھی کبھی کسی محفل میں ترجمہ کے فرائض انجام دیتا ہوں۔ ترجمہ تینوں زبانوں (اردو، عربی اور انگریزی) میں انجام دینا پڑتا ہے۔ گزشتہ دو سال سے میرا ایک لڑکا حامد ندوی میری ہر موقع کی تقریریں، ٹیپ میں محفوظ کر رہا ہے، ان شاء اللہ کسی وقت ضبط تحریر میں بھی آجائیں گی۔

مضمون نگاری

دار العلوم ندوۃ العلماء سے فراغت سے قبل باضابطہ مضمون لکھنا مجھے یاد نہیں، اردو میں میرا پہلا مضمون ملیشیا کے عالمی مقابلہ میں شرکت کے بعد مارچ ۱۹۶۴ء کو واپسی پر "ملیشیا میں دو ہفتے" کے عنوان سے نکلا جو بعد مقبول ہوا اور روزنامہ "سیاست" و روزنامہ "رہنمائے دکن" حیدرآباد میں بڑی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا، اور بڑی داد و تحسین ملی۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے بعض مضامین نشر کئے گئے، جن میں قابل ذکر (۱) مولانا عبد الماجد دریابادی بحیثیت مفسر (۲) نصائح و ملفوظات حضرت امام اعظمؒ (۳) علامہ اقبال ایک اسلامی شاعر (۴) شہادت امام حسینؓ (۵) حج اور عمرہ (۶) حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ وغیرہ۔

۱۹۶۵ء میں ہر جمعہ کو میری قراءت و تفسیر حیدرآباد ریڈیو سے نشر ہونے لگی اور یہ سلسلہ میرے امریکہ جانے تک قائم رہا یعنی پندرہ سال، ہر ماہ کم از کم دو ہفتے میرے نشرئے ہوتے اور سینکڑوں عناوین پر یہ تفسیری مضامین لکھے گئے، میں عنوان کے مطابق پہلے ریڈیو پر قراءت کلام کی آیتیں تلاوت کرتا، پھر ترجمہ و تفسیر بیان کرتا تھا۔

الحمد للہ یہ "نشریات قرآنیہ" بڑے شوق سے سنی گئیں، عوام الناس اور علمی

حلقوں دونوں میں بیحد مقبول ہویں، جو نشریات محفوظ رہ گئی ہیں اب طباعت کے مرحلہ میں ہیں۔

میں نے ایک مضمون (مقالہ) ایم اے (عربی) کے زمانہ میں "جاحظ" پر لکھا تھا جو بیحد پسند کیا گیا، اب نظرثانی کے بعد اس کو شائع کیا جارہا ہے۔ اور امید ہے کہ جامعات کے ایم اے (عربی) کے طلباء خصوصاً اس سے ضرور مستفید ہوں گے۔

حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ پر پہلے نشریہ کے لئے مختصر مضمون لکھا گیا تھا، بعد میں ایک مستقل مضمون (مقالہ) کی صورت میں تیار ہوگیا ہے، اور اس کو عنقریب طبع کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

ریڈیو پر جن مضامین کو پڑھا گیا، ان مضامین کے علاوہ بھی کچھ مضامین بعد میں مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے تھے، ان تمام مضامین کو بھی یکجا کر کے کسی عنوان کے تحت شائع کیا جائے گا۔

گزشتہ چند سالوں سے سیرت پاک پر مختلف سیرت کی مجلسوں میں جو دارالعلوم الاسلامیہ بأمریکا (امریکہ) میں منعقد ہوے، اس گدائے بے نوا نے شہنشاہ کونینؐ کی سیرت پر تقریباً ۲۱ مقالے پڑھے، جو بیحد مقبول و معروف ہوے، اب ان تمام مقالوں کو یکجا جمع کر کے "سیرت شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم" کے عنوان سے طبع کرنے کی ابتداء حیدرآباد میں ہوچکی ہے، اور یہ ساری (مذکورہ) کتابیں میرے ہی خرچ پر طبع کی جارہی ہیں۔ **الحمد للہ علیٰ ذلک**۔

انگریزی مضامین کے لکھنے کا سلسلہ امریکہ آنے کے بعد شروع ہوا یعنی ۱۹۸۱ء سے، اور یہ مضامین اکثر جمعہ کے دن عربی خطبہ سے قبل پڑھے گئے، تعداد میں تقریباً پچاس ہوں گے، جو ہر ہفتہ تیار کئے جاتے اور جمعہ کے دن پڑھے جاتے ہیں، اور بعض مضامین کو سیرت کے جلسوں میں اور نکاح کی محفلوں میں پڑھنے کا بھی اتفاق ہوا، ان سب مضامین کو اب یکجا کیا جارہا ہے، اور امریکہ ہی میں "خطبات غوث" کے عنوان

سے (ORATIONS OF GHOUSE) کے نام سے شائع کیا جائے گا ان شاء اللہ۔

اب رہا عربی میں مضمون نگاری کا کام تو اس کو "تصنیفات و تالیفات" کے عنوان پر تفصیل سے لکھا جائے گا۔ اس جگہ ایک مضمون (مقالہ) کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ ۱۹۶۴ء میں حضرت اعلیٰ حضور نظام آصف سابع حیدرآباد کے حکم سے، ان کے استاد حضرت انوار اللہ شاہؒ رحمۃ اللہ علیہ کی حیات پر میں نے ایک مقالہ لکھا تھا جس کا نام "ساعة مع العارف الكبير" ہے، اور اسی سال حضرت کے عرس میں اس کو پڑھا گیا تھا، میرے مقالہ کو جب سامعین نے سنا تو وہ پھڑک گئے اور کھل کر داد و تحسین دی، اور علماء و مشائخ حیدرآباد نے بھی اس مقالہ پر بڑا اچھا تاثر ظاہر فرمایا تھا۔ دوسرے دن دربار آصفی میں میری طلبی ہوئی اور مجھے خلعت و گراں قدر انعام سے سرفراز کیا گیا۔

الحمدللہ یہ مقالہ بہت عرصہ ہوا مطبعہ عزیزیہ حیدرآباد نے میرے ہی خرچ پر چھاپ دیا ہے۔ ان شاء اللہ دیگر مضامین و مقالات کا ذکر ہم تصنیفات و تالیفات میں تفصیل سے لکھیں گے۔

باب (۲۴)

تصنیفات و تالیفات

الحمدللہ میری تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سندی سال سے شروع ہوا، اور سب سے پہلا "مقالہ" (تالیف) "غزوات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ضوء القرآن والأحادیث" ہے، جو (عربی میں) ندوہ کے عالمی سندی سال میں لکھا گیا اور دارالعلوم میں سند کے لئے پیش کیا گیا، پھر چند سال

بعد نظر ثانی کے ساتھ طبع کیا گیا۔

دوسرا" مقالہ " (تصنیف) اعلیٰ حضرت آصف سابع کے حکم سے، ان کے استاذ حضرت انوار اللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی پر لکھا گیا، اور اس پر اعلیٰ حضرت نے خلعت و انعام سے سرفراز فرمایا (جس کی تفصیل پہلے آچکی ہے) یہ مقالہ بھی عربی زبان میں ہے، جو طبع ہو چکا ہے۔

تیسرا مقالہ "الجاحظ" ہے جو عربی ادب کا مایہ ناز ادیب تھا اور جس کی کتابیں عربی ادب میں شاہکار ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں جب میں ایم اے (عربی) کا امتحان دے رہا تھا، اس وقت خصوصی ادیب کے حیثیت سے "جاحظ" شریک نصاب تھا، اس پرچہ کی تیاری کے موقع پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے طلبا۔ ایم اے (عربی) کو مواد کے جمع کرنے میں بڑی دقت محسوس ہو رہی تھی، میرے اور ان سب کی آسانی کے لئے پھر ہند و پاک کی ہر یونیورسٹی کے طلبا۔ کے سہولت کے خاطر یہ مقالہ لکھا گیا تھا، یہ مقالہ اردو زبان میں ہے، اور ایک عرصہ سے اصرار تھا کہ جاحظ کی زندگی اور کام کے متعلق کوئی اردو میں کتاب نہیں ہے، اس لئے اس تحقیقی مقالہ کو بھی شائع کیا جائے۔ چنانچہ وہ اسی سال ۱۹۹۶ء میں شائع کیا جارہا ہے۔

چوتھا تحقیقی مقالہ جو میری ساری زندگی کا سرمایہ اور نچوڑ ہے وہ ڈاکٹریٹ (Ph.D) کے لئے لکھا گیا (جو عربی زبان میں ہے) اور جس کا عنوان "**التحقیق العلمی فی قراءات القرآن السبع والتعلیق علی کتاب التبصرۃ فی القراءات السبع لمکی بن أبی طالب**" (المتوفی ۴۳۷ھ) ہے، اس تحقیقی کتاب پر پہلے ایک مقدمہ لکھا گیا ہے جو تقریباً دو سو صفحے پر مشتمل ہے، جو فن قراءات سبع کی تحقیق پر سولہ عنوانات قائم کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

اس مقدمہ کے بعد اصل کتاب "**کتاب التبصرۃ فی القراءات السبع**" پر تحقیق ہے، جو ۵۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ الحمد للہ میرا یہ تحقیقی کام جامعہ عثمانیہ

حیدرآباد کے (عربی زبان) "دکتوراۃ" [Ph.D] کے لئے کیا گیا تھا۔ اور ڈگری حاصل ہونے کے قبل ہی عثمانیہ یونیورسٹی کی اجازت سے، عالمی شہرت یافتہ ادارہ "دائرۃ المعارف العثمانیہ" سے میرے خرچ پر طبع کیا گیا، اور جامعہ عثمانیہ میں ڈاکٹریٹ کے لئے داخل (Submit) کیا گیا، اور اس پر ممتحنین کی جو رائیں آئیں وہ نہایت موقر اور قابل تحسین تھیں اور اس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری ۱۹۸۰ء میں عطا کی گئی (Ph.D کی ڈگری پر وائس چانسلر نے ممتحنین کی رپورٹیں اس تحقیق کے متعلق سنائی تھیں اس کی تفصیل میں گزشتہ صفحات میں لکھ چکا ہوں)

الحمدللہ اس تحقیقی کام کو بعد میں پانچ ہزار کی تعداد میں الدار السلفیہ بمبئی نے شائع کیا اور دنیا کے کونے کونے میں اسے پہنچادیا، مشرق وسطی میں اس کتاب پر ادارے لکھے گئے، اور علمی حلقوں میں یہ کتاب مشہور و معروف ہوی، اب بھی جب میں مشرق وسطی کی کسی یونیورسٹی میں جاتا ہوں تو وہ مجھے محقق کتاب التبصرۃ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور الجامعۃ الاسلامیۃ مدینہ منورہ اور جامعہ ام القریٰ کے کلیۃ القرآن میں قراءات سبع کی تعلیم کے نصاب میں اس کتاب کو شریک نصاب کیا گیا ہے، اور اس کتاب کے مختلف موضوع پر اکثر "محاضرات" کے لئے حجاز مقدس جانا ہوا اور الحمدللہ حکومت سعودیہ نے مکہ مکرمہ کے عالمی مقابلہ قراءات القرآن پر مجھے دو بار حکم (جج) کی حیثیت سے ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۵ء میں مدعو کیا، اور میں نے ان دو عالمی مقابلوں میں حکم کے فرائض انجام دئے۔ العظمۃ للہ۔

پانچواں تحقیقی کام "مسانید النساء" پر ہے۔ جو ۱۹۸۱ء سے شروع ہوا اور ۱۹۹۱ء میں ختم ہوا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ "دائرۃ المعارف" میں مختلف مسانید پر میری نظر پڑی، لیکن یہ مرد صحابہ کرامؓ پر کام تھا، جیسے مسند ابی بکرؓ مسند علیؓ وغیرہ، لیکن

صنف نازک کی کوئی مسند مجھے نہ مل سکی۔ ۱۹۸۱ء میں ہر جگہ اس سلسلہ میں کوشش کی لیکن کہیں بھی اس طرح کی تحقیق نہ ملی۔ میں نے "صحابیات" کی زندگی اور ان کا علمی شغف اور ان کی حدیثیں پڑھیں تو محسوس کیا کہ ان کے علمی کارنامے خصوصاً فن حدیث پر ان کا شغف پردۂ خفا میں تھا، اگرچہ کہ ان کی احادیث مختلف "جوامع" میں موجود ہیں، لیکن ان پر تحقیقی کام نہ ہوا تھا۔ ان پر تحقیق کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اب سنیئے اس سلسلہ میں میں نے مختلف "جوامع" کا مطالعہ شروع کیا اور "جمع الجوامع" علامہ سیوطیؒ کی کتاب اس باب میں بیحد عمدہ پائی۔ اور اس میں "باب النساء" کے حصے کو تحقیق کا مرکز بنایا۔ اور اس کے تین تحقیقی کام مقرر کئے :

(۱) مسند عائشہ صدیقہؓ

(۲) مسانید امہات المؤمنینؓ

(۳) مسانید الصحابیاتؓ

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مسند کو پہلے اس لئے ترجیح دی گئی کہ یہ دیگر امہات المؤمنین کے مقابلہ میں سب سے زیادہ علم و فضل کی مالک تھیں اور ان کی احادیث بھی ساری صحابیات سے زیادہ تھیں۔ اس لئے سب سے پہلے اسی مسند پر تحقیقی کام کیا گیا۔ شروع میں حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ کے حالات زندگی ان کا علم و فضل اور ساری خواتین امت پر ان کی علمی و دینی فضیلت اور ان کے وہ خصوصی فضائل جو ان میں تھے اور کسی میں نہ تھے، ان کا ذکر اور ان کے حالات زندگی کی تفصیل مقدمہ میں لکھی گئی۔ پھر ان کی مسند (احادیث) پر تحقیق و تعلیق کا کام انجام دیا گیا، اس طرح یہ کتاب ۲۵۰ صفحات پر الدار السلفیہ بمبئی سے شائع ہوئی اور علمی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ **الحمد للہ علیٰ ذلک**۔

چھٹی تحقیق "**مسانید أمہات المؤمنینؓ**" ہے، جن میں دیگر (۱۰) اُمہات المؤمنین کے حالات زندگی اور ان کے علمی کارناموں کے ساتھ ان کی مسانید کی

تحقیق کی گئی ہے اور الحمدللہ یہ کتاب بھی الدار السلفیہ سے چھپ چکی ہے اور علمی حلقوں میں مقبول عام ہے۔

ساتویں علمی تحقیق " " مسانید الصحابیات" " ہے ، جن میں پچپن صحابیات کے حالات زندگی ہیں اور ان کی مسانید پر تحقیقی کام بھی ،اور یہ کتاب بڑی تقطیع پر تقریباً ۱۳۰ صفحوں میں دائرۃ المعارف میں طبع ہو چکی ہے۔غرض، صنف نازک (حضرات صحابیاتؓ) کے کارناموں اور احادیث پر تحقیقی کام کا یہ غالباً پہلا اور اپنی نوعیت کا عمدہ کام ہے ، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھ گناہگار کے ہاتھوں لے لیا، قربان جائیے اس کی شان کریمی کے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل سے یہ خدمت حدیث بھی اس بے علم کے ہاتھوں انجام دلادی ۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خدمت حدیث کو قبول فرمائے ۔آمین !

آٹھواں تالیفی کام " مقالات سیرت " ہے ، یہ وہ مقالات ہیں جو گزشتہ ۵ سالوں میں دار العلوم الاسلامیہ بأمریکا (کیلیفورنیا) امریکہ ، میں سیرت کے جلسوں میں پیش کیے گئے اور الحمدللہ بیحد مقبول ہوے ۔اصرار ہوا کہ ان کی طباعت کی جائے ، لہذا اب ان مقالات سیرت کو " سیرت شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم " کے عنوان سے اس گدائے بے نوا کی طرف سے شائع کیا جارہا ہے۔

نواں تحقیقی کام "نشریات و شخصیات" یا مضامین غوث کا ذکر پہلے کر چکا ہوں ، ان مضامین کو بھی مزید مضامین کے ساتھ جلد شائع کیا جائے گا۔ان شاء اللہ العزیز۔

دسواں شعری کام ہے شاعری کی تفصیل بعد میں آئے گی۔"نغمۂ کلام" پر ایک مختصر مجموعہ جو میں مختلف موقعوں پر کہتا آیا ہوں ان سب کو یکجا کر کے اب اس نغمۂ کلام میں سے ان اشعار کو شائع کر رہا ہوں ، جو اہل علم میں کم از کم شعر کہے جاسکتے ہیں۔ خدا کرے یہ کام بھی پورا ہو جائے ، اور مداحین سرور کونینؐ کی فہرست میں اس فقیر و بے نوا کا نام بھی آجائے۔

باب (۲۵)

تعلیم و تعلم

یعنی طالب علمی اور معلمی

دین کا ہر کام اچھا ہے، اور اس پر اجر و ثواب کے وعدے ہیں، لیکن تعلیم و تعلم پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے کا کام ان میں سب سے عمدہ ہے، ارشاد سرور عالمؐ ہے۔ "**خیرکم من تعلم القرآن وعلمه**" ۔ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن مجید (کے علوم) کو سیکھے اور سکھائے۔ الحمدللہ جب سے میں باشعور ہوا، اسی وقت سے اس پڑھنے پڑھانے کا کام کرتا رہا ہوں، جامعہ نظامیہ سے کلام اللہ حفظ کرنے کے بعد ۱۲ سال کی عمر سے میں نے دوسروں کو حفظ کرانے کی خدمت انجام دی، قراءات سبع کی تکمیل ۱۵ سال کی عمر میں ہو چکی تھی، مساجد کے صباحی مدرسوں میں حفظ و قراءات و تجوید کی تعلیم ۱۴، ۱۵ سال کی عمر سے ہمیشہ دیتا رہا، مدراس میں ۱۷ اور ۱۸ سال کی عمر میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹ ویں سال کی عمر میں ندوہ میں داخل ہوا اور عمر کے ۲۳ ویں سال میں یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلا، یہ زمانہ سکھانے سے زیادہ سیکھنے کا تھا تاہم اپنے درجہ کے کمزور طلباء کو وہاں پڑھاتا رہا۔ باضابطہ طالب علمی کا زمانہ "ندوہ" سے فراغت کے بعد ختم ہوتا ہے لیکن اب بھی میں ادنیٰ طالب علم ہی ہوں، سرور عالمؐ کا ارشاد ہے کہ "**اطلبوا العلم من المهد الى اللحد**" علم (دین) کو گہوارے سے لے کر قبر کے گڑھے (لحد) میں جانے تک سیکھتے رہو۔

اس طرح یہ سیکھنے سکھانے کا سلسلہ ندوہ کی فراغت کے بعد باضابطہ شروع ہو گیا، تین سال "دائرۃ المعارف" میں علمی تحقیق سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ اس زمانے میں بھی روزانہ فجر کے بعد مقامی مسجد میں باری باری تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس دیتا

رہا، اور ہر جمعہ کو کسی دینی عنوان پر ایک مجمع کثیر میں تقریر کرتا تھا۔ پھر اسلامیہ ہائی اسکول میں مدرس کی حیثیت سے عربی و اردو پڑھاتا رہا۔ یہ سلسلہ آٹھ سال رہا۔ . . . (۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۲ء)۔ اس مدت میں سینکڑوں طلباء کو مستفید کیا اور مستفید ہوتا رہا۔ پھر کالج میں پڑھانے کی زندگی ۱۹۷۳ء سے شروع ہوی۔ اور ۱۹۷۸ء تک جاری رہی، انوار العلوم کالج مسلمانوں کا سب سے بڑا کالج تھا جہاں ہزاروں طلباء نے مجھ سے عربی زبان سیکھی، اور ان میں سے بعض نے اب عربی ادب میں ڈاکٹریٹ بھی کر لی ہے۔

۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰ء میں جامعات میں پڑھانے کی سعادت حاصل ہوی، اور یہ اعلیٰ تدریسی سلسلہ دو سال قائم رہا۔ پھر مستقلاً امریکہ منتقل ہو گیا اور یہاں ۱۹۸۱ء سے اسلامک سوسائٹی میں بچوں اور بڑوں کو پڑھانے کا سلسلہ جاری رہا، اور تقریباً اس اسلامک سوسائٹی (جماعت اسلام) میں سات سال دینی خدمات انجام دیتا رہا۔ اور الحمدللہ ۱۹۸۸ء سے "دار العلوم الاسلامیہ بامریکا" کی تاسیس اور اس کی دینی و انتظامی امور کی خدمات اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور اس کی تائید سے اب تک میرے ذمہ ہیں۔

غرض، یہ تعلیم و تعلم، پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے و سکھانے کا سلسلہ میری عمر کے ۱۲ ویں سال سے شروع ہوتا ہے جب کہ میں حفظ کلام اللہ سے فارغ ہو گیا تھا۔ اور اب میری عمر کا ۵۷ واں سال ہے، یعنی تقریباً ۴۵ سال سے تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ جاری ہے، (اور دعا ہے کہ تادم زیست جاری رہے)، اس حقیر علمی خدمت کو میں سب سے بڑا ذریعہ نجات سمجھتا ہوں، اور اس کو حدیث نبویؐ کے مطابق "**أو علم ینتفع به الناس**" کے باقیات صالحات میں سمجھتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے امیدوار کرم ہوں کہ وہ اس حقیر خدمت دین کو قبول فرمائے گا اور اگر یہ تعلیمی

خدمت بارگاہ خداوندی میں کسی درجہ بھی قبول ہو گئی تو یقیناً مغفرت کی امید ہے، پروردگار عالم اس خدمت کو قبول فرما، اور اس کے سقم و خرابی کو دور فرماکر مقبولیت کی سعادت سے سرفراز فرما۔ آمین

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(الف) اپنی نااہلی، عاقبت اندیشی اور اپنی علمی بے بساطی پر غور کرتا ہوں، اور اپنی حقیر خدمات کا جائزہ لیتا ہوں، ہزاروں سقم اور خامیوں کے یہ کام جیسے بھی ہوا غرض وہ وجود میں آگئے، ورنہ ہم کیا اور ہماری بساط کیا۔ شان کریمی و کارسازی کے بس قربان جائیے کہ وہ چاہے تو کاہ سے کام کوہ کا، اور چیونٹی سے کام ہاتھی کا لے لے۔ یہ کام جو مجھ سے کسی طرح بھی بن پڑا البشر ہونے کے ناطہ ان میں لغزشیں ضرور ہوی ہوں گی، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے معاف فرمائے، اور قارئین کرام سے عرض ہے کہ وہ اس پر آمین کہیں۔

(ب) غرض، انسان کیا اور اس کی خواہشیں کتنی، بقول غالب

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

کتنی ہی آرزوئیں اور تمنائیں ایسی ہیں کہ ان کی حسرت انسان قبر میں ساتھ لے جاتا ہے! یہ عمر دراز تو بس چار دن کی ہے، وہ بھی دو حسرتوں میں اور دو انتظار میں ختم ہوجاتی ہے۔

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو حسرتوں میں کٹ گئے دو انتظار میں

باب (۲۶)

معاشی و مالی زندگی

حکومت آصفیہ کا زوال ۱۹۴۸ء میں ہوا، اس وقت میری عمر ۷، ۸ سال کی تھی، اس حادثہ عظمیٰ کے کوئی ۲ سال قبل میں مدرسہ وکٹوریہ میں شریک ہوا، والدین کی اقتصادی حالت حکومت آصفیہ کے زوال کے قبل قدرے اچھی تھی، بہتر ہرگز نہ تھی، حکومت کے زوال کے بعد ساری جائیدادیں لٹیں اور ہم گھر سے بے گھر کر دیئے گئے، اور اسی ناداری میں ہم کو ہجرت کرنی پڑی، اور غربت و ناداری کا شدید دور آیا، اور برابر ہم پر مسلط رہا، کئی دن اور رات فاقوں میں گزرے، جب میں جامعہ نظامیہ میں داخل ہوا تو وہاں کے (پوری مدت) تین سالوں میں میرے پاس صرف ایک کرتہ اور پائجامہ کے سوا کچھ نہ تھا، ہر جمعرات بعد ظہر کسی کی لنگی مستعار لے کر اور اس جوڑے کو دھو کر پہنتا رہا، بار بار پہننے اور دھونے کی وجہ کپڑوں میں سفید جویں پڑجاتی تھیں اور شدید اذیت دیتی تھیں، اس موقع کا ایک واقعہ یاد آگیا، ایک مرتبہ جمعرات کے دن بعد ظہر میں اپنے کپڑے دھو رہا تھا، قریب میں کسی طالب علم کی لنگی دھوپ میں سوکھ رہی تھی، اس کو پہن لیا، اور اپنے جسم کے کپڑے دھونے لگا، اتفاق سے وہ صاحب آگئے اور غصہ سے کہنے لگے کہ فوراً لنگی اتار دو ورنہ میں اتروادوں گا، میں نے بڑی لجاجت کی کہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی کپڑا نہیں ہے۔ براہ کرم مجھے ان کپڑوں کے سوکھنے تک موقع دیجئے وہ نہ مانے اور میرے جسم سے لنگی زبردستی کھینچ لی اور مجھے برہنہ کر دیا، مدرسہ کی درگاہ میں میں نے پناہ لی، گویا اس وقت میری حالت یہ تھی کہ حضرت دادا آدم کی طرح جنت خلد پہنچ گیا، زبان حال سے یہ آیتیں پڑھنے لگا۔

"ان لک الّا تجوع فیھا و لا تعریٰ و انک لا تظمأ فیھا و لا تضحیٰ"

(یہاں تو تمہیں یہ آسائشیں حاصل ہیں کہ نہ بھوکے ننگے رہتے ہو اور نہ پیاس دھوپ تمہیں ستاتی ہے) ۔ غرض کسی طرح وہی گیلے کپڑے پہن لیا اور کچھ دیر تک روتا رہا۔

جامعہ نظامیہ کے داخلہ کے دوسرے سال بانی جامعہ کے عرس کے موقع پر ایک بڑے مجمع میں جلسہ کے آغاز میں میں نے قراءت پڑھی اور میرے جسم پر پیوند لگے کپڑے تھے ۔ اللہ حضرت الیاس برنیؒ پروفیسر جامعہ عثمانیہ کی مغفرت فرمائے، وہ جلسہ کے بعد میرے پاس آئے اور کہا تم کیا پڑھتے ہو، میں نے بتایا کہ کلام اللہ کے ۲۸ پارے اب تک حفظ کر چکا ہوں اور دو باقی ہیں، فرمایا کیا تم کو مدرسہ سے کپڑوں کا انتظام نہیں ہوتا ؟ کہا نہیں، صرف اعلیٰ جماعت کے طلباء کو یہ کپڑوں کا وظیفہ مقرر ہے، پھر از راہ عنایت تین جوڑے نہایت عمدہ سلوا کر میرے لئے مدرسہ بھیجا۔ اور گاہ گاہ جب مدرسہ کی طرف گزر ہوتا تو وہ آتے اور مل کر کچھ پیسے دے جاتے۔

حفظ کی تکمیل کے بعد تین سال نہایت تنگدستی کے گزرے۔ جامعہ نظامیہ میں تو یہ تھا کہ اعلیحضرت حضور نظام کی طرف سے قیام و طعام کا معقول نظم تھا، اور اب نہ تو رہنے کو مکان تھا اور نہ کھانے کا کوئی نظم، صرف ٹیوشن پر زندگی کا گزارہ تھا، جس مسجد میں، میں امامت اور پڑھانے کا کام کرتا تھا، وہاں ایک کمرہ بغیر چھت کے دیا گیا تھا، جہاں صرف پکانے کا کچھ سامان رکھ لیا تھا۔ اس زمانے میں غربت و ناداری نے خوب خوب ستایا اور دنوں فاقے گزرے، اور بعض وقت تو بھوک سے نیم بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی۔

عمر کے سولھویں سال میں مدراس گیا، وہاں مسلمانوں نے آنکھوں پر بٹھایا، دلوں میں جگہ دی، عسر یسر سے بدلا اور نہایت خوش حالی کا زمانہ تھا، تقریباً تین سال تک یہ خوش حالی کا زمانہ رہا۔

عمر کے ۱۹ ویں سال میں ندوۃ العلماء میں بغرض تعلیم داخل ہوا، پانچ سال میں

فارغ التحصیل ہوکر نکلا، ان پانچ سالوں میں حضرت الاستاذ مربی من مولانا علی میاں مدظلہ کی اعانت و کرم فرمائی برابر جاری رہی ، ۲۴ ویں سال کے آغاز میں دائرۃالمعارف میں مصحح کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی، ماہانہ تنخواہ ۹۹ روپے تھی الحمدللہ گزارہ ہوجاتا تھا کہ ۲۵ ویں سال کے آغاز میں شادی ہوی ۔شادی کے ابتدائی ۲ سال نہایت عسرت کے گزرے، عمر کے ۲۷ ویں سال میں مدرسہ اسلامیہ میں معلم کی حیثیت سے ملازم رہا، حالات قدرے اچھے ہونے لگے، اور پھر سات سال بعد یعنی ۳۴ ویں سال انوار العلوم کالج میں لکچرر و صدر شعبہ ۔عربی رہا۔یہ زمانہ خوشحالی کا تھا، نیز اسی زمانے میں سسرالی جائیداد سے غلہ کی آمد شروع ہوی اور یہ خوش حالی کا دور تقریباً مزید سات سال رہا کہ ۱۹۸۱ء میں امریکہ کی طرف مستقل ہجرت عمل میں آئی اور ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا، الحمدللہ یہ نہایت ہی خوش حالی کا زمانہ تھا، اس ملازمت کا سلسلہ بھی سات سال رہا، اور ۱۹۸۸ء میں دارالعلوم الاسلامیہ بأمریکا کا قیام اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھوں اپنے فضل و کرم سے پورا کروایا، اور اسی زمانے میں میرے لڑکے بڑے ہوکر کاروبار میں لگ گئے، اور الحمدللہ، اللہ تعالیٰ نے اس کاروبار میں بڑی برکت عطافرمائی ۔اس کے علاوہ ہمارے ہندوستان کی جائیداد میں عجیب و غریب برکت کا سامان نکل آیا، جو ہر طرح کی خوشحالی کا سبب بنا۔الحمدللہ، اللہ تعالیٰ نے جیسے نوازا ویسے خرچ کی بھی توفیق دی ہے ۔جس کے اظہار سے ڈر ہے کہ اجر ضائع نہ ہوجائے ۔اللہ تعالیٰ کا نہایت ہی شکر ہے کہ اس نے ہم سب پر خصوصی فضل فرمایا، علمی، دینی و مالی، ہر طرح کی دولت سے سرفراز فرمایا۔

اب دعا ہے کہ آخرت ہر طرح بخیر ہو، اسلام کی حالت میں زندگی گزرے، اور ایمان کی حالت میں موت آوے ۔آمین ۔

غرض مالک و مولیٰ کا شکریہ کس منہ سے ادا کیا جائے کہ حق و استحقاق سے کہیں زیادہ کتنی نعمتوں سے سرفراز کر رکھا ہے ۔اب عمر مستعار کی مدت ہی کتنی لیکن

بہرحال جتنی بھی ہو وہ دین کی خدمت، اور اللہ ہی کی یاد میں گزرے۔ اور خاتمہ ایمان پر ہو۔ آمین۔

باب (۲۷)

شعروشاعری

شاعری کہئے یا تک بندی اس کا تھوڑا بہت خبط بچپن ہی سے سر میں سمایا ہوا تھا، ٹوٹے پھوٹے شعر جو ادھر ادھر کہیں سن پاتا، یا کہیں پڑھ لیتا بس اکثر یاد ہو جاتے، اور انھیں موقع بے موقع پڑھ کر سنادیا کرتا۔

جامعہ نظامیہ میں حفظ کلام اللہ کا زمانہ تھا، اور مسلمانوں کی نکبت و پریشانی کا زمانہ تھا، اس کو اخباروں میں پڑھتا، اور بزرگوں سے سنتا تو خوب روتا۔ غالباً اسی زمانے میں ایک نظم کہہ ڈالی تھی، جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

تجھ پہ نکبت کیوں مسلماں آج ہے
روٹی کپڑے کو تو کیوں محتاج ہے

یہ زمانہ طالب علمی اور وہ بھی حفظ کلام اللہ کا زمانہ تھا، عمر دس گیارہ سال ہوگی، میرے استاذ مولانا عبدالحفیظ جنیدی مدظلہ نے (جو ان دنوں جامعہ کے دورہ فاضل کے طالب علم تھے) مجھے سختی سے روکا، اور کہا کیوں وقت ضائع کرتے ہو بس اپنے حفظ میں لگے رہو۔ یہ جذبہ ۴، ۵ سال رکا رہا، جب میرا قیام میری منہ بولی ماں حضرت زینب بی کے پاس تھا، اور وہ جس گھر میں کرایہ سے تھیں، اس مکان کے مالک کی لڑکی نہایت خوب صورت تھی، غالباً اس کی عمر ۱۴ سال کی تھی اور اپنی عمر ۱۶ سال کی، (عین ابھرتی دچلاتی جوانی)، ایک بار میں منہ بولی ماں کے پاس آیا، وہ گھر پر نہ تھیں، وہ مہ رو حسین لڑکی دروازے پر آئی اور کہا کہ وہ تو گھر پر نہیں ہیں آپ

پھر تشریف لائیں، بس غضب ہو گیا، اس کی میٹھی آواز اور چہرہ کا نقش و نگار بس دل میں اتر گیا اور جگہ پکڑ گیا، گویا میری حالت بقول شاعر یہ تھی :

ألمت فحيّت ثم قامت فودّعت

فلما تولّت كادت النفس تزهق

غرض میں اکثر آتا رہا اور دور ہی سے دیدار ہوتا رہا، اور کبھی کبھی آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ غرض،

ان کے کوچے سے اک شام گزرا تھا میں
پھر یہی روز کا مشغلہ بن گیا

اور اب مسلسل میری حالت غیر تھی، اور آگ ادھر بھی لگی ہوی تھی (دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوی) اور یہ مسلسل بڑھتی گئی اور سر چڑھتی گئی، میرے ایک محسن استاذ (جن کا ذکر کر نا یہاں سوء ادبی ہے) اس بڑی بی کے پاس اکثر آتے تھے بلکہ انھیں کی کرم فرمائی کی وجہ سے میں یہاں آتا تھا، جب ان کی نگاہ اس مہ جبیں پر پڑی تو وہ بس اس کے (لٹو) عاشق ہو گئے اور میں جو کسی وقت ان کا محبوب شاگرد تھا اب وہ مجھی کو رقیب سمجھنے لگے، عشق بھی کیا بری چیز ہے کہ کیا کیا کھیل کھلاتا ہے، اس محسن و مربی استاذ نے میرا آنا جانا اس بڑی بی صاحبہ کے پاس بند کروا دیا۔ لیکن میرے محسن استاذ کا عشق یکطرفہ تھا، جب انھوں نے اس لڑکی کو پیام دے بھیجا تو اس نے صاف انکار کر دیا، اور کہا کہ میرے محبوب تو محمد غوث ہیں اور میں انھیں سے شادی کروں گی، بس اب کیا تھا، مجھ پر ان کا غضب ٹوٹنے لگا اور بقول غالبؔ :

اسد اب تو لینے کے دینے پڑے

اور اب اس کے در و دیوار کے دیدار تک سے محروم کر دیا گیا۔ غرض میں دعا کرتا رہا کہ پروردگار اس لڑکی کو انھیں کے حوالے کر دے، میری یہ دعا تو قبول نہیں

ہوی مگر میں ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو گیا۔ اس طولانی خامہ فرسائی کو آپ معاف فرمائیں ۔ مگر میری شاعری سے اس کا گہرا تعلق ہے اور اسی تعلق کو بتانے کے لئے یہ تمہید باندھی گئی ہے۔ کچھ دن اس کے فراق میں ایسے کٹے کہ دل کے پھپھولے زبان پر شعر کی صورت میں اجاگر ہو گئے اور اس کے فراق میں بہت سے اشعار زبان سے نکلے، یہاں ایک غزل نقل کرتا ہوں جسے بعد میں میں نے تھوڑے تصرف کے ساتھ نعتیہ کلام کی طرف پھیر دیا کہ حق بحقدار رسید :

اے مری جاں نگار تم سے ہے
زندگی کی بہار تم سے ہے
یوں تو دنیا میں ہیں ہزاروں حسیں
کیا کروں مجھ کو پیار تم سے ہے
بے کلی نام ہے یہ دنیا کا
میرے پیارے قرار تم سے ہے
مجھ کو ٹھکرا نہ دو مرے محبوب
کیوں کہ میرا وقار تم سے ہے
گردشِ نجم کیا، نصیبا کیا
صَرف لیل و نہار تم سے ہے
ڈال کر پیرہن فقیرانہ
غوثؔ اب باوقار تم سے ہے

اس طرح اس کے ہجر میں تڑپتا رہا، کبھی کبھی روتا بھی، اس زمانے کے کچھ شعر آپ بھی سن لیں :

دل کو بھاتی ہیں یار کی باتیں
پیاری ہوتی ہیں پیار کی باتیں

ذکر اس گل کا بجز میں بلبل
ہے غزاں میں بہار کی باتیں
اس قدر بیقرار کیوں ہو غوث
یاد کیا آئیں یار کی باتیں

غرض یہ عشق کا سودا ایک سال تک چڑھتا رہا، چڑھتا اور بڑھتا اور سر چڑھ کر بولتا رہا، پھر معلوم ہوا کہ اس لڑکی کی شادی ہو چکی ہے، لیکن میرے محسن استاذ سے نہیں، بلکہ کسی اس کے ہموطن یادگیری رشتہ دار سے، اب یہ نشہ آہستہ آہستہ اترنے لگا، اور پھر میں اسی زمانے میں مدراس چلا گیا، کبھی کبھی یہ عشق مجازی ستاتا، اور کچھ شعر کہلواتا رہا۔ پھر حالات زمانہ نے اس واقعہ کو بھی بھلا دیا۔

اس کے بعد علامہ اقبال کی شاعری میرے دل و دماغ پر چھائی رہی، اور سینکڑوں شعر کلیات اقبال کو پڑھتے پڑھتے یاد ہو گئے، اس شاعری نے لمان کی ایک حرارت دل میں پیدا کر دی، ہر جگہ اقبال کے اشعار محل بے محل پڑھتا اور داد لیتا رہا

پھر غالب میر تقی میر اور داغ کے کلام کو خوب پڑھا ان کے عمدہ اشعار یاد ہو گئے، پھر صوفی امجد حیدر آبادی کے کلام کو جھوم جھوم کر پڑھتا رہا اور سینکڑوں شعر ان کے اب بھی یاد ہیں، زیادہ تر ان کی رباعیات۔ ایک رباعی تو ہمیشہ ہر موقع پر، موقع نکال کر اور مضمون کو ترتیب دے کر تقریروں میں اکثر پیش کرتا ہوں۔ آپ بھی سن لیں

تو مجھ سے قریب تر، میں تجھ سے نزدیک
کیا بات ہے ہم دونوں میں کیوں بات نہیں
کچھ اس کا سبب بھی سمجھا امجد
میں تیرے ساتھ ہوں تو میرے ساتھ نہیں

کاش اللہ تعالیٰ کی معیت کا یہ احساس ہر بندے کو نصیب ہو جائے کہ " **وھو معکم أینما کنتم** " حضرت امجد کو اس سیاہ کار آنکھوں نے دیکھا اور ان کے کلام کو جھوم جھوم کر پڑھتے ہوئے انھیں سنا ہے۔

غرض شاعری یا تک بندی کا یہ دور ایک عرصہ تک رکا رہا، گزشتہ پانچ سال سے سیرت پر چند مقالے لکھنے کی سعادت حاصل ہوی، اور اس کو جوش عقیدت کے ساتھ پڑھ کر محفلوں میں سناتا رہا، اور اسی درمیان عربی، فارسی اور اردو کے نعتیہ کلام کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھا، اور ایک مقالہ (مضمون) " نعتیہ کلام بہ حضور سرور خیرالانامؐ " لکھا جو مقالات سیرت میں شامل ہو کر " سیرتِ شہنشاہ کونینؐ " میں طبع ہو چکا ہے۔

ان گزشتہ پانچ سالوں میں نعتیہ کلام پر کچھ لکھنے کی سعادت بھی حاصل ہوی اور جب کبھی طبیعت موزوں ہوی کچھ نعتیہ شعر زبان سے نکل آئے، ان میں سے چند چیدہ چیدہ نعتیہ شعر پیش خدمت ہیں۔

یاد رہے کہ میں نے اپنے تخلص کو چار طرح سے استعمال کیا ہے۔ غوث، حافظ، قاری، اور کبھی کبھی ندویؔ لیجئے اس سیاہ کار کے کچھ نعتیہ شعر آپ بھی سن لیں :

منہ سے کسی کے نام نبیؐ جب نکل گیا
سینے میں عاشقوں کے کلیجہ اچھل گیا

مدت ہوی تلاش نبیؐ میں نکل گیا
پہلو میں دل ہمارا نہیں آجکل گیا

حافظ بلا میں یار بھی اغیار بن گئے
قسمت بدل گئی تو زمانہ بدل گیا

OOOOO

ثنائے شاہ دوعالم نے دو شرف بخشے
جہاں میں نام ہوا حشر میں ثواب ملا

سنائی مدحتِ روئے نبیؐ جو حافظؔ نے
خدا سے بلبلِ فردوس کا خطاب ملا

OOOOO

مجھ کو مرے خدا نے بڑا مرتبہ دیا
اپنے حبیب خاص کا عاشق بنا دیا

وصفِ لبِ نبیؐ کا جناں میں صلا دیا
حوروں نے مجھ کو ساغر کوثر پلا دیا

شوخی زباں کی حسنِ بیاں سے بدل گئی
قاریؔ غزل کو ہم نے قصیدہ بنا دیا

OOOOO

امت کی نظر ہے حضرت پر ، حضرت کی نظر ہے امت پر
اترائے نہ کیوں وہ قسمت پر ، حافظؔ بھی انھیں کے ہے پیاروں میں

OOOOO

دامن رحمت تمہارا یاد آتا ہے مجھے
اے شہِ دیں وسعت ارض و سما کو دیکھ کر

دی بشارت جنت فردوس کی جبریل نے
روز محشر حافظِ مدحت سرا کو دیکھ کر

OOOOO

نگاہ تمنا جھکی جارہی ہے ، نہ جانے یہ کیسا مقام آرہا ہے
دھڑکنے لگا ہے دلِ مضطرب کیوں ، محمدؐ کا ہونٹوں پہ نام آرہا ہے

یہ میدان محشر تماشا تو دیکھو ، یہ کون آج مست خرام آرہا ہے
فرشتے نگاہیں بچھانے لگے ہیں ، تمام انبیاء کا امام آرہا ہے

دم نزع ندوی کوئی کہہ رہا ہے ، بلاتے ہیں چل تجھ کو طیبہ میں آقا
مقدر تو دیکھو نبیؐ کی طرف سے ، جواب و سلام و پیام آرہا ہے

اللھم صل علی محمد و علی آلہ و أصحابہ أجمعین

OOOOO

شاعروں میں سب سے زیادہ میرا محبوب شاعر اقبال ہے ، غزل گوئی میں غالب کا معتقد رہا ہوں ، میر تقی میر کی سیدھی سادی شاعری نے بڑا متاثر کیا ہے ، مومن اور داغ کا کلام بیحد پسند ہے ۔ صوفیانہ کلام میں حضرت امجد میرے محبوب شاعر ہیں ۔ مسدس حالی کا عاشق ہوں ، حضرت اکبر الہ آبادی کے ظریفانہ کلام کو جس میں حقیقت و معنویت بھری ہوی ہے اکثر پڑھتا ہوں ۔ غرض ، اردو شاعری میں میں نے بہتوں کو پڑھا ، لیکن میری پسند کے شاعروں کے کچھ نام لکھ کر چھوڑے دیتا ہوں ۔ میر تقی میر ، غالب ، مومن ، داغ ، حالی ، اکبر ، امجد اور اقبال ۔ اور کچھ اور بھی ، اور چلتے چلتے یہ بھی عرض کر دوں کہ جس طرح مریض بہت معمولی طبیبوں بلکہ نیم حکیموں کے ہاتھ سے

بھی شفا پاجاتے ہیں ۔اسی طرح یہ ضروری نہیں کہ ہر شعر کا کہنے والا بھی کوئی اعلیٰ شاعر ہو، بعض بہت معمولی، مجھ جیسے شاعر بھی شعر بہت اچھا کہہ جاتے ہیں :

شوخی زباں کی حسنِ بیاں سے بدل گئی
قاری غزل کو ہم نے قصیدہ بنا دیا

انگریزی شاعری سے مطلق مس نہیں، فارسی میں شعر کہنے کی استعداد نہیں، ہاں عربی کی الحمدللہ استعداد ہے لیکن اس میں شعر کہنے کی جرأت نہیں کی۔

غوث کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تونے

OOOOO

باب (۲۸)

سیاسی زندگی

جب اپنے ہوش کی آنکھیں کھلیں، تو میں نے حکومت آصفیہ کے دبدبے دیکھے، عمر اس وقت کوئی سات برس کی ہوگی، ۱۹۴۸ء میں حکومت آصفیہ کا زوال ہوا، ہندوستان کے سیاسی حالات سے اس وقت میں بالکل ناواقف تھا، البتہ بزرگوں سے تحریک خلافت، کانگریس، اور مسلم لیگ جیسی سیاسی جماعتوں کے نام سنتا تھا، حیدرآباد میں جو سیاسی پارٹی بڑے زوروں پر تھی، وہ رضاکاروں کی پارٹی تھی، ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی، اور حیدرآباد کی ریاست اب بھی مسلم

مملکت تھی، حکومت ہند کی للچائی نظر اس سونے کی چڑیا (حیدرآباد) پر بری طرح پڑ رہی تھی، اور ادھر حیدرآباد دکن میں رضاکاروں کے صدر قاسم رضوی، جوش میں بھری ہوی، تقریریں کر رہے تھے کہ کل لال قلعہ دہلی پر مسلمانوں کی فتح کا جھنڈا لہرادیں گے اور حکومت ہند کی فوج کے چھکے چھڑادیں گے، وغیرہ وغیرہ، اس زمانہ کی سیاست پر (ہندوستان میں) مولانا ابوالکلام آزاد، مسٹر نہرو، گاندھی جی، اور مسٹر محمد علی جناح کے نام سنے، اور اخباروں میں پڑھے۔ اور حیدرآباد میں اس وقت قاسم رضوی سیاست پر چھائے ہوے تھے، ہندوستان کی تقسیم کا انجام، مسلمانان ہند کے لئے اتنا دردناک و الم انگیز ہوا، کہ اس صورت حال کا کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مسلمانوں پر جو کچھ گزری، اور اب تک جو کچھ گزر رہی ہے، اس پر دل خون کے آنسو روتا ہے، اور دل بار بار یہ سوال کرتا ہے کہ ہجرت اب بھی فرض نہ ہوگی تو پھر کب ہوگی۔ لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت کی جائے تو آخر کدھر کو کی جائے۔ مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک میں مسلمانوں کے لئے دروازے بند ہیں، اور پاکستان میں جو لوگ ہجرت کر گئے، ان کو اور ان کی اولاد کو اور ان کی اولاد کی اولاد کو آج بھی دوسرے نہیں، تیسرے درجہ کا شہری بنادیا گیا ہے اور ان کی اولاد تک کو آج مہاجر کے نام سے پکارا جاتا ہے، وہاں کے مہاجرین کی زندگی، ہندوستان کے مسلمانوں سے کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ اور پاکستان میں آج کل جو قتل عام ہے، اور اسلام اور مسلمانوں کے نام پر جو وہاں کھیل کھیلا جارہا ہے، وہ سارے عالم کے مسلمانوں کے لئے شرمندگی کی بات ہے۔ خدایا ہماری اصلاح فرما۔

تقسیم ہند کے بعد اور حیدرآباد کے پولیس ایکشن کے بعد مسلمانوں پر یہاں کیا گزری بس اللہ ہی جانتا ہے، لاکھوں جانیں تلف ہویں، جائیدادیں لٹیں، ہزاروں عصمت مآب لڑکیوں کی عصمتیں لٹیں، اور وہ وہ مظالم مسلمانوں پر ڈھائے گئے کہ الامان و الحفیظ، اب تک ان مظالم کے آثار نہیں مٹے ہیں۔ اور جہاں تک سیاست سے

میرا تعلق ہے، میں نے بچپن سے آج کی تاریخ ۵۷ سالہ عمر تک کبھی بھی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ لیکن میں اپنا واضح موقف بھی "سیاست" کے بارے میں بتلائے دیتا ہوں کہ اسلام میں سیاست شجرہ ممنوعہ نہیں، اچھی سیاست صاف ستھری زندگی کے لئے "رحمت" ہے لیکن اب سیاست کا معنی، چوری، ڈکیتی، لوٹ مار اور اپنے مفاد کے لئے مختلف فرقوں کو لڑا دینے، دولت بٹورنے اور ملک میں فسادات کروا کر اپنا الو سیدھا کرنے کے سوا کیا رہ گیا ہے۔ آج سیاست اور شرافت دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے، اگر صحیح اصولوں پر اس کو چلایا جائے، تو یقیناً یہ ہر ایک کے لئے سکون و رحمت ہے۔ غرض سیاست کو اسلام سے جدا نہیں کیا جاسکتا، ورنہ بقول علامہ اقبال:

"جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"

○○○○○

باب (۲۹)

بیعت وارادت

پیری مریدی کا نام میں نے سب سے پہلے جامعہ نظامیہ حیدرآباد کی طالب علمی کے زمانے میں سنا، اور جامعہ کے ماحول میں، ہر شب جمعہ قصیدہ بردہ جب پڑھا جاتا تھا تو میں اس وقت اکثر شریک ہوا کرتا تھا، اسی ماحول میں نیاز شریف، گیارھویں شریف رجب کے کنڈے اور فاتحہ شریف کے نام سنے، اور اکثر ان محفلوں میں شریک رہا۔ تصوف و پیری مریدی کے صحیح معنے سے ایک عرصے تک میں ناواقف رہا۔ حضرت پیران پیر غوث اعظم کا نام کثرت سے سنا، ان سے عقیدت پہلے اس طرح ہوی کہ حضرت کے نام نامی اسم گرامی پر میرا نام ایک بزرگ نے رکھا تھا یعنی غوث اور اتفاق

سے ۱۱ ربیع الثانی (گیارھویں شریف) کے دن میری پیدائش ہوی تھی۔ گیارھویں شریف کی محفلوں میں ان دنوں شریک ہوتا تھا۔ امریکہ میں ایک میرے کرم فرما ہیں وہ ۱۱ ربیع الثانی والی تاریخ سے ایک ہفتہ قبل مجھے مطلع کرتے رہتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ گیارھویں شریف آرہی ہے اور وہ دن آپ کا (BIRTHDAY) بھی ہے، اور خوب عمدہ کھانے پکا کر لاتے رہتے ہیں۔ میں انھیں منع کرتا ہوں لیکن وہ نہیں سنتے۔ غرض حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی عظمت و بزرگی میرے دل میں اس وقت بیٹھی جب کہ میں نے ان کی مشہور و معروف کتاب **غنیۃ الطالبین** پڑھی، سبحان اللہ! توحید و رسالت اور سنت مطہرہ کے احیاء اور رد بدعات پر کیا ہی عمدہ کتاب ہے، کاش کہ آج کا مسلمان ان کی تعلیمات پر عمل کرتا اور بدعات کو ترک کرتا۔

جامعہ نظامیہ کے دور طالب علمی کے تین سال تک (یعنی ۱۱ سال سے ۱۳ سال) کی بدعات غیر اختیاری صادر ہوتی رہیں، کیونکہ ماحول کا اثر تھا مجھے اس کا احساس بھی نہ ہوا، بعد میں جب علم دین کی تحصیل کی تو پتہ چلا کہ بدعات کیا ہیں اور کن چیزوں کی اصلاح کرنی ضروری ہے۔

غرض بچپن اور نوخیز جوانی میں فقیروں، مجذوبوں، اور نیم مجذوبوں سے خوب پالا پڑا، اور ایک مدت تک، ان کے مستانہ نعرے، ہوحق کی محفلیں، قوالی کی مجلسیں بھی مرکز عقیدت بنی رہیں۔ مزارات اور درگاہوں کی زیارت اور عرسوں میں شرکت کرتا رہا، قوالی میں امجد کی رباعیات پر جھوم جھوم سا جاتا تھا، غرض ندوہ کی زندگی میں یہ ساری بدعات چھوٹیں۔

صحبتیں بعض طویل اور بعض سرسری و مختصر، وقت کے اچھے اچھے اہل دل و ارباب طریق سے رہیں۔ بعض بزرگوں کے نام آپ بھی سنتے چلیں: حضرت مولانا سید عبداللہ شاہ نقشبندی، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری، مولانا پاوشاہ

حسینی، مولانا غوثی شاہ، مولانا حسام الدین کامل حسامی، حضرت محمد حسین شاہ فاروقی، مولانا ابوالوفا۔ صاحب افغانی، شیخ حبیب العیدروس، حضرت مربی و محسن من مولانا محمد ابراہیم شاہ صاحب قابل ذکر ہیں، مگر عقیدت صرف تین بزرگوں سے ہوئی یعنی حضرت عبداللہ شاہ صاحب، حضرت محبوب حسین شاہ صاحب اور حضرت محمد ابراہیم شاہ صاحب سے۔ حضرت محبوب حسین شاہ صاحب بڑے جلالی بزرگ تھے، اس لئے بیعت کی ہمت نہ ہوی حضرت عبداللہ شاہ صاحب بحد جمالی بزرگ تھے، لیکن جب بیعت کا داعیہ پیدا ہوا تو وہ بس چراغ سحری تھے۔ اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ کے کیا کہنے کہ ان میں جلال و جمال، اخلاص، تدین، رسوخ فی الدین، بے ریائی، حب رسول، تقویٰ و طہارت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، حضرت شاہ ابراہیم صاحب اس معیار پر کھرے اور پورے اترے، لیکن بیعت کی پابندی سے جی چراتا رہا، ارادہ بار بار ان سے بیعت کا ہوا، اور رہ رہ گیا۔ پھر درمیان میں بڑا وقت گزرا، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت ہوی پھر دائرۃ المعارف سے وابستگی ہوی اور پھر شادی۔ اب ۱۹۶۵ء میں جبکہ میری عمر ۲۶ سال کی تھی کہ تلاش مرشد پھر شروع ہوی، ہر متبع سنت، جامع شریعت و طریقت بزرگ کو ٹٹولنا شروع کیا، بعض نامی گرامی بزرگ (جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں) ان میں کے اکثر خدا کو پیارے ہو چکے تھے۔ غرض جامع شریعت و طریقت بزرگ، (جو بچپن سے میرے محبوب استاذ، محسن و مربی تھے) یعنی حضرت مولانا حافظ قاری شاہ محمد ابراہیم صاحب سے بیعت کی درخواست کی، وہ مجھ پر ایسے کرم فرما تھے کہ میری درخواست سے پہلے ہی یہ گزارش ان کی بارگاہ میں منظور تھی۔ اور منظور ہوی۔

بزرگ اور بھی بہت دیکھنے میں آئے، سب اپنی اپنی جگہ قابل تعظیم و احترام، لیکن بہ حیثیت مصلح، مزکی، معلم و مرشد حضرت کو فرد فرید پایا۔ اپنی اس محرومی و حرماں نصیبی کو کیا کہئے کہ حضرت سے اتنی رسائی ہوجانے کے بعد بھی بے مایہ و

تہی دست ہی رہا۔ جو اول میں کورا تھا، وہ آخر تک کورا ہی رہا۔

الحمد للہ ! ۱۹۷۰ء میں، حضرت نے خلافت سے مشرف فرمایا اور یہ خلافت چاروں سلاسل سے عطا ہوئی۔ لیکن پھر بھی ناکارہ ہی ہوں، پڑھنے والے جب اس مقام پر پہنچیں تو حسبۃً للہ اس ناکارہ و ننگ خلائق کے حق میں دعائے خیر فرمادیں۔ یہ کسی قسم کا مطالبہ نہیں، محض ایک بھیک ہے۔

حضرت پیر و مرشد محمد ابراہیم شاہ رحمتہ اللہ علیہ کا وصال ۱۹۸۳ء میں ہوا، پھر تلاش مرشد شروع ہوی، اس بار تلاش میں وقت نہ لگا، استاذ محترم حضرت مفکر اسلام علامہ سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ پر نظر جم گئی، دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ، ندوہ سے علم دین کی تکمیل تک حضرت ممدوح کی سرپرستی پہلے ہی سے حاصل تھی، میں نے اپنے عریضہ میں بیعت کی خواہش کی، حضرت نے بخوشی منظور فرمایا، اور میں رائے بریلی جاکر اس سعادت سے مشرف ہوا۔ اب حضرت ممدوح کے دامن سے وابستہ ہوں، دینی و دنیوی زندگی کے ہر مرحلے میں ان کی رہنمائی حاصل کرتا رہتا ہوں۔ گزشتہ سال ۱۹۹۵ء میں میری اہلیہ کی خواہش پر حضرت نے ان کو بھی بیعت میں شامل فرمالیا ہے۔ بار الہا ! میری اور میری اہلیہ کی دلی و روحانی اصلاح فرما۔ اور ہم کو تقویٰ و طہارت کی زندگی عطا فرما (آمین)۔

وابستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

OOOOO

باب (۳۰)

سفر

الحمدللہ ، سفر میں نے بہت کئے ، اور بہت دور دراز کے ، بچپن میں سفر بجز حیدرآباد کے کہیں اور نہ ہوسکا ، کچھ دور بیل گاڑی میں پھر نلگنڈہ سے بس کے ذریعہ حیدرآباد کا ہجرت والا سفر۔

۱۵ سال کی عمر میں بذریعہ ٹرین بنگلور کا سفر کیا ، جہاں تراویح میں کلام پاک سنا آیا ، پھر ۱۶ ویں سال میں مدراس کا سفر ہوا ، اس کے بعد مستقل ٹرین کے اسفار بغرض تعلیم لکھنؤ ، دہلی ، سہارنپور ، دیوبند کے ہوتے رہے ۔ لیکن زیادہ تر سفر لکھنؤ کے ہوے جبکہ میں دارلعلوم ندوۃ العلماء کا طالب علم تھا ، دہلی بیسیوں بار جانا ہوا ، اکثر کل ہند مقابلہ قراءت میں حکم [جج] کے فرائض انجام دینے کے لئے اور ایک بار عالمی مقابلہ قراءت ملیشیا میں بحثیت امیدوار کے ، اور ایک بار عالمی مقابلہ قراءت دہلی میں حکم کے فرائض انجام دینے کے لئے ۔ غرض ٹرین کے سفر حسب ذیل مقامات کے ہوے : دہلی ، سہارنپور ، دیوبند ، علی گڑھ ، لکھنؤ ، بمبئی ، مدراس ، آگرہ ، بنگلور ، میسور ، کالی کٹ ، سورت ، جھانسی ، بھوپال ، کلکتہ ، وغیرہ ۔ یہ اسفار زیادہ تر تعلیمی غرض سے یا پھر کسی مذہبی فرض کی انجام دہی کے لئے یا تحقیق و ریسرچ کے لئے ہوے ، سفر برائے سفر یا بطور تفریح بہت کم ہوے ۔

ہوائی جہاز کا سفر سب سے پہلے ۱۹۶۴ء میں ملیشیا کا ہوا ، وہ سفر عالمی مقابلہ قراءت میں حکومت ہند کی نمائندگی کے لئے تھا ، جہاں میں نے امتیازی کامیابی حاصل کی ۔ واپسی میں سنگاپور سے بمبئی کا سفر ہوا اور وہاں سے حیدرآباد کا ، پھر کسی یونیورسٹی کے ممتحن کے طور پر اور کسی مقابلہ قراءت میں حکم کے فرائض انجام دینے

کے لئے بار بار ہندوستان میں ہوائی سفر بھی ہوتے رہے۔

۱۹۸۰ء میں امریکہ کا سفر ہوا، جہاں میں تراویح میں قرآن پاک سنانے اور ایک اسلامک سوسائٹی میں بچوں اور بڑوں کو پڑھانے کے لئے گیا تھا، واپسی میں لندن سے ہوتا ہوا، ہندوستان پہنچا۔ اور چند دن بعد حج بیت اللہ کے لئے حجاز مقدس کا سفر ہوا۔ اور بار بار ہوتا رہا۔ ۱۹۸۱ء میں پھر سارے افراد خاندان کے ساتھ امریکہ کا سفر ہوا، اور اس کے بعد سے تو سفر کا سلسلہ بندھ گیا، گویا ہر سال ہندوستان کا سفر ہوتا ہے اور بار بار حجاز مقدس کا سفر بھی ہوتا رہتا ہے۔ **الحمد للہ علیٰ ذلک**۔

امریکہ کے مقامی سفر میں حسب ذیل مقامات کا سفر ہوا اور اکثر ہوتا رہتا ہے۔ لاس اینجلس، سینتیاگو، ہوسٹن، سیاٹل، سان فرانسسکو، کینساس، شکاگو، نیویارک، ڈٹرائیٹ، بوسٹن وغیرہ۔

عالمی سفر حسب ذیل ہیں :

جدہ (حجاز مقدس) امریکہ، لندن، جرمنی، دوبئی، کویت، سنگاپور، ملیشیا، ہانگ کانگ، تائیوان، جاپان، تھائی لینڈ، کناڈا، فرانس، ترکستان اور پاکستان وغیرہ۔

آرام طلب کبھی نہ رہا اور نہ ہی آرائش پسند ہوں، ناداری میں ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کیا، جب اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے تو اکثر فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہوں، کیونکہ میں خود خادم ہوں، سفر میں کبھی کوئی خدمت گار نہ رکھا۔

میزبان بحمد اللہ چھوٹے بڑے سب ہی ملے، کس کس کا نام لوں، ہندوستان سے شروع کرتا ہوں۔ مدراس میں الحاج چودھری برہان الدین صاحب کے پاس قیام، سبحان اللہ ایسی خاطرداریاں کہیں نہ دیکھیں، بنگلور میں میرے محسن و مربی حضرت الاستاذ مولانا محمد ابرہیم صاحب کی کرم فرمائی، اور استاذ محترم مولانا عبد الحفیظ جنیدی مدظلہ کی نوازشیں خوب یاد ہیں۔ اور ابھی ۱۴/ نومبر ۱۹۹۶ء کے سفر بنگلور میں

محترمہ حنا سلمھا کی میزبانی اور ان کے والد محترم سید ضیاء اللہ شریف صاحب کی میزبانی نے گزشتہ ساری خاطرداریوں کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ دہلی میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب کی شفقت و عنایات اور ان کی طرف سے ہر طرح کے خبر گیری نے گویا وطن کا لطف دیا، سہارنپور میں حضرت الاستاذ شیخ زکریا صاحبؒ کی میزبانی ضرب المثل تھی، اور بمبئی میں کریم بھائی کی مہربانیاں ہمیشہ یاد کے قابل ہیں۔ بیرونی ملکوں میں، ملیشیا میں تو ہم حکومت کے مہمان تھے، روزانہ افطار پر ایک ایک دن وزیر کے پاس پرتکلف دعوت ہوتی، اور آخری دن بادشاہ سلامت کی میزبانی نے تو آنکھوں کو خیرہ کر دیا، پھر سنگاپور میں ایک رئیس کبیر محمد میاں کی خاطرداریاں رہیں، جو اب تک یاد ہیں۔

امریکہ و یورپ میں بیسیوں کرم فرما ہیں، اور ان کی میزبانی بھی یاد کے قابل ہے۔ پاکستان میں ایک بڑے رئیس محمد امین باوانی کی میزبانی رہی، جو کہ (FIVE STAR) ہوٹل میں دعوت عیش دیتی تھی، مکہ مکرمہ میں، حکومت سعودیہ کی میزبانی، جو عالمی مقابلہ حفظ القرآن و قراءت کے موقع پر دو بار ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۵ء میں ہوی وہ، ہر طرح یاد کے قابل ہے، ایک بار اس مقابلہ میں مبصر کی حیثیت سے، اور دوسری بار بحیثیت حکم کے میں نے شرکت کی تھی۔ العظمة لله، اور حجاز مقدس مکہ مکرمہ میں عزیزم مولوی علی عبید کربان سلمہ، کی محبت اور بے لوث قربانی، اور عظیم الشان میزبانی اب بھی ہر آمد پر ہوتی رہتی ہے۔ اور مکہ مکرمہ ہی کے جناب سید صداقت علی کی کرم فرمائی اور جناب صلاح صاحب کی پرتکلف دعوتیں یاد کے قابل ہیں، اللہ ان سب کو ان کے مقام کے مطابق جزائے خیر دے۔ آمین۔

باب (۳۱)

صحت جسمانی

بچپن میں اپنی کوئی ایسی سخت بیماری یاد نہیں پڑتی، جب ہجرت کر کے حیدرآباد پہنچا، تو مدرسہ وکٹوریہ کے دارالاقامہ میں شریک تھا، وہاں روزانہ ڈرل کرائی جاتی تھی، کھیلوں میں فٹ بال، والی بال (BASKET BALL)، لانگ جمپ (لمبی چھلانگ)، ہائی جمپ (اونچی چھلانگ) کی بھی کچھ مشق کی۔ جامعہ نظامیہ حیدرآباد میں یہ سب کچھ نہ تھا، جب مدراس پہنچا تو کرکٹ کا شوق بھی ہوا، مگر گنتی کے چند دن، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تو بس پڑھنا اور سیکھنا رہا۔ ایک بار بڑی شدت کا بخار آیا اور بہت ستایا، مولانا علی میاں مدظلہ کی بروقت دستگیری نے علاج و معالجہ کا نظم فرمادیا، الحمدللہ بہت جلد صحت یاب ہوگیا۔ شادی کے بعد ملیریا کا کئی بار حملہ ہوا، غرض مستقل ورزش کی عادت کبھی نہ رہی، اور پیدل ہواخوری کی مشق کبھی چند ہفتوں سے زیادہ نہ چلی۔ الحمدللہ تمباکو، سگریٹ وغیرہ سے ہمیشہ محترز رہا ہوں، پان کبھی کھایا بھی تو تفریح طبع کے طور پر، چائے کی عادت چالیس سال تک نہ رہی، لیکن گزشتہ سترہ سال سے صبح ایک بار بعد ناشتہ پی لیتا ہوں، اور کبھی کبھی بعد عصر بھی۔

جوانی میں صحت الحمدللہ اچھی رہی، اور اب جبکہ ۵۷ سال کا ہوگیا ہوں، الحمدللہ اچھا ہی ہوں۔ علمی کام کی مشغولیت اور پڑھنے پڑھانے کی کثرت کی وجہ سے اور کچھ بدپرہیزی کی وجہ سے اب قدرے صحت پر اثر پڑا ہے، لیکن الحمدللہ ہر قسم کی مہلک اور عظیم بیماری سے (بفضل خدا) محفوظ ہوں۔ ہماری امریکہ کی فیملی ڈاکٹر محترمہ رضوانہ صاحبہ کی مخلصانہ نصیحت کی وجہ سے، بعد فجر یا بعد عصر پیدل ہواخوری شروع کر دی ہے، لیکن ایک دو میل سے کبھی زیادہ نہیں ہوی۔ اور اس میں بھی اکثر ناغے

ہو جاتے ہیں۔ پھر انھیں کی موعظت پر روزانہ پندرہ بیس منٹ تیزی سے چل لیتا ہوں، کھانا اکثر وقت پر نہیں کھاتا، مگر بھوک لگنے پر ضرور کھاتا ہوں، کھانے میں کسی خاص چیز کا اہتمام نہیں، جو بھی میسر ہو کھالیتا ہوں۔ جوانی میں غذا زبردست (غضب کی) تھی، الحمدللہ ایک مرغ تو عام بات تھی، اکثر سسرال میں دو دو مرغ بھی اڑا یا گیا۔

الحمدللہ عام صحت اچھی ہے، (اس پر ہمیشہ خدا کا شکر بجالاتا ہوں)، کھاتا رغبت سے ہوں، مسلمانوں کی پرتکلف غذائیں پلاؤ، بریانی، پراٹھے، دم کا مرغ وغیرہ دل سے پسند ہیں۔ اللہ نے اس دنیا میں جہاں مجھے نیک بیوی عطا کی ہے، وہیں ان کو عمدہ کھانا پکانے اور خوب کھلانے کی بھی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ غرض کھانے کا شوقین ہوں، اور خوراک بھی ماشاءاللہ خاصی ہے۔ لیکن الحمدللہ، مرغوب ترین و لذیذ ترین غذاؤں کا کبھی بھی حریص نہیں رہا۔

تنگدستی اور ناداری عین جوانی تک رہی، لیکن خوشحالی کا دور الحمدللہ گزشتہ پچیس سال سے ہے، اور اب تو بفضل خدا نیم رئیسانہ زندگی گزر رہی ہے، ان حالات میں صحت والی نعمت کی قدر ہوتی ہے، بقول غالبؔ :

تنگدستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

دائیں آنکھ کا عارضہ بچپن میں ہمارے ایک مہربان بھائی کی کرم فرمائی سے شروع ہوا تھا، اور جوانی میں وہ عارضہ بڑھتا گیا، اور بڑھتے بڑھتے ۳۳ سال کی عمر میں، اس آنکھ سے اشیاء کو پہچان تو ضرور لیتا ہوں، لیکن یہ آنکھ پڑھنے کے قابل نہیں رہی، غرض نعمت کا دینا اور لینا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ پروردگار! ہم کو زوال نعمت سے بچا اور جو نعمتیں آپ نے اپنے فضل و کرم سے عطا فرمائی ہیں، انھیں باقی رکھ اور ہماری کوتاہیوں کو معاف فرما۔ اور اپنی شان کریمی سے ہمارے

لئے رحمت و رأفت کا معاملہ فرما۔آمین۔

ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

باب (۳۲)

عام معیشت اور عادات و اطوار :

لباس لڑکپن سے اب تک ایک ہی طرح کا رہا، جو متوسط شریف گھرانوں میں رائج تھا، کرتا، قمیص، پاجامہ، بنیان، شیروانی، دوپلی، رومی ٹوپی، (ترکی ٹوپی) رامپوری ٹوپی اور جناح کیپ وغیرہ، لباس سفید رنگ کا بیحد پسند ہے۔ابتدائی طالب علمی کے زمانے میں صرف کرتا پاجامہ ہی میسر ہو سکا، بنیان و سوئٹر کبھی اس زمانہ میں نصیب نہ ہوا بلکہ ایک عرصہ تک سونے کے لئے بستر تک نہ تھا۔

مدراس میں کرتے قمیص کے ساتھ سفید لنگی کا استعمال رہا، لیکن دعوتوں میں کرتا پاجامہ شیروانی ہمیشہ استعمال کرتا رہا۔مدراسی احباب جب یہ کہہ کر چڑانے لگے کہ "اوپر شیروانی اندر پریشانی" تو پھر وہاں شیروانی خال خال رہ گئی۔لکھنو میں آکر کپڑوں کا ذوق بدلا، مہین کرتا و پاجامہ یہاں کا عام لباس تھا، موسم سرما میں شیروانی و سوئٹر کا اہتمام رہتا تھا۔

شادی کے بعد بھی میرا لباس وہی سیدھا سادھا رہا، جب معاشی حالات بہتر ہوے تو عمدہ لباس استعمال میں رہے۔لیکن کبھی بھی یہود و نصاری کا لباس یا کفار و مشرکین کے لباس کا تشبہ اختیار نہیں کیا۔

اچھے کھانے کا شوق ہمیشہ رہا، جب معاشی حالات اچھے ہوے تو ہر طرح کے عمدہ کھانے شوق سے کھائے اور کھاتا ہوں، پلاؤ بریانی، قورمہ، شامی کباب، مرغ،

مچھلی، انڈا، گھی، مکھن، غرض نمکین و میٹھے کھانوں کا شوق رکھتا ہوں۔ شام کے کھانے میں زیادہ تر میووں اور پھلوں کا استعمال ہے۔ لیکن عام غذا دال، سالن، روٹی، چپاتی اور پراٹھے ہیں۔

۱۳ سال کی عمر تک کبھی بھی کوئی سواری میسر نہ آئی۔ ۱۴ ویں سال سے سیکل خوب شوق سے چلاتا رہا۔ ۳۳ ویں سال اسکوٹر کا استعمال رہا، اور جب سے امریکہ آیا ہوں موٹر کی سواری کرتا ہوں، الحمدللہ گھر میں ۲، ۳ عمدہ موٹریں ہیں، اور سب ہی لڑکوں اور لڑکیوں کے پاس علٰحدہ (موٹر کی) سواریاں ہیں۔ اب ہمیشہ متوسط درجہ کی خوش حالی کے ساتھ رہتا ہوں۔ بلکہ الحمدللہ نیم رئیسانہ زندگی ہے۔

لڑائی جھگڑا، فساد، مقدمہ بازی سے پرہیز کرتا ہوں، میرے دوست احباب بچپن ہی سے بہت کم ہیں اور جو ہیں ان کو بڑا عزیز رکھتا ہوں، اہل ثروت سے ہمیشہ دور رہتا ہوں، دعوتوں میں بہت کم جاتا ہوں، اسی لئے دعوتیں بھی بہت کم کرتا ہوں۔ غریبوں اور اللہ والوں کو کھانا کھلانے کا بڑا شوق ہے۔ بحث و مباحثہ سے بہت گھبراتا ہوں۔ عمر کے ساتھ غصہ بھی بڑھتا جارہا ہے، جب غصہ کا موقع ہوتا ہے تو وہاں سے کہیں دور ہٹ جاتا ہوں، خلاف شرع عمل پر بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کی عادت جوانی ہی سے پڑی ہوی ہے۔

اچھی کتابیں پڑھنے کا شوق سرشت میں داخل ہے، فجر و مغرب کے بعد وظیفہ کی عادت بھی ہے، اچھی کتاب جب بھی ہاتھ لگ جائے، تو پروا کسی چیز کی نہیں رہتی، احباب جب ملنے آتے ہیں تو اکثر کام کی بات کرتا ہوں، کوشش کرتا ہوں کہ حکمت و موعظت سے کچھ ان کو فائدہ پہنچا سکوں۔ جب علمائے حق و اہل اللہ سے ملاقات ہوتی ہے تو بس انھیں کی سنتا ہوں کہتا کچھ نہیں، بس کسی سوال ہی پر مختصر جواب دیتا ہوں۔

اچھے شعر سننے، سنانے کا بڑا شوق ہے، بچپن میں قوالی اور گانے سننے کا شوق بھی

تھا لیکن خال خال، وہ بھی ندوہ کی علمی زندگی کے بعد جاتا رہا۔ تھیٹر، سینما کا کبھی شوق نہ رہا، بلکہ اس سے نفرت ہے، اور الحمدللہ ! آج بھی امریکہ جیسی خوشحال زندگی میں " TV " نہیں رکھتا کہ اس کے مضر اثرات مجھ پر اور اہل خانہ پر نہ پڑیں۔ اخبار بینی کا شوق تو نہیں، لیکن دنیا کے حالات سے باخبر رہتا ہوں۔ اور اپنی تقریروں و تحریروں میں ان خبروں کے اچھے اور برے پہلوؤں پر خوب کھل کر بولتا اور لکھتا ہوں۔

الحمدللہ ! ارکان اسلام کی پابندی کی ہر طرح کوشش کرتا ہوں لیکن حق کبھی ادا نہ ہوا، عبادات میں حضور قلب جسے کہتے ہیں، اس سے سراسر محروم ہوں، نمازیں الٹی سیدھی پڑھ لیتا ہوں، رمضان میں روزے پابندی سے رکھتا ہوں اور ان میں حضور قلب کسی درجہ حاصل ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ سال بھر کے مسنون روزے بھی نہ چھوٹنے پائیں، لیکن ان میں پابندی کبھی نہیں ہوی جب جنت کا شوق موجزن ہوتا ہے، یا گناہوں پر نظر پڑتی ہے تو تہجد کی کچھ رکعتیں نصیب ہو جاتی ہیں، اور " **عین بکت من خشیة الله** " والی حدیث کو سامنے رکھ کر کچھ آنسو بھی بہا لیتا ہوں۔ بس اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس سیاہ کار کی خطائیں معاف فرمائے اور دوزخ کی آگ سے محفوظ فرمائے، اور اپنے فضل سے جنت الفردوس عطا کرے۔ آمین۔ حرمین شریفین کی زیارت کا بڑا شوق ہے، کوشش کرتا ہوں کہ ہر سال حاضری دوں۔ اور اللہ کے فضل سے گزشتہ پندرہ سال سے ایسا ہی ہو رہا ہے، بلکہ کبھی سال میں دو بار بھی۔ (اللہ معاف کرے) کہ جوانی میں خود بینی و خود نمائی اور واہ واہ کا بڑا مرض تھا، خصوصاً ملیشیا سے واپسی پر "عالمی شہرت یافتہ قاری" کا خواہ مخواہ دھوکا سا ہو گیا تھا، کچھ عرصہ تک یہ بھوت سوار رہا، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد یہ مرض کم ہو گیا لیکن بالکل جاتا نہ رہا اور امریکہ جانے کے بعد سے تو خود بینی و خود نمائی کا ذوق کافور ہو گیا ہے۔ اب الحمدللہ اپنی تعریف سے نفرت کرتا ہوں۔

طبیعت زیادہ ملنے جلنے کی خوگر نہیں، عقلاً و تجربتاً بھی زیادہ میل جول میں

برائیاں ہی زیادہ نظر آتی ہیں ۔ پھر بھی خشک مزاج نہیں ہوں ، اور لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملتا ہوں ۔ بچوں سے بڑی محبت ہے ، ان کو پیار کرتا ہوں اور ان سے خوب کھیلتا ہوں ۔

زبانی بحث و مباحثہ سے بہت گھبراتا ہوں ، زبان بے دھڑک نہیں کھلتی ، اور ڈرتا ہوں کہ غصہ میں کیا کچھ زبان سے نکل جائے ، اور پکڑ کا باعث بن جائے ۔ الحمد للہ مزاج میں بخل و اسراف کبھی نہ رہا ، میانہ روی ہمیشہ رہی بلکہ ہاتھ ہمیشہ کھلا رہا ، غرض کسی کی جائز سعی و سفارش میں دریغ نہیں کرتا بلکہ مخاطب کا لحاظ رکھ کر سفارش کرتا ہوں ۔ نیز مجبوروں کے لئے سفارش قبول بھی کرتا ہوں ۔

باب (۳۳)

مؤثر ، محسن ، عزیز شخصیتیں

بچپن سے اب تک اپنی سیرت و کردار پر چھوٹی بڑی جتنی بھی شخصیتیں اثر انداز ہوی ہیں ، سب کو گنانے لگوں تو خود ایک دفتر تیار ہو جائے ، ایک لمبی فہرست کو چھوڑ کر ذکر صرف انھیں کا کروں گا ، جن کا اثر پائیدار اور نمایاں رہا ہے ۔ یہ فہرست بھی اچھی خاصی طویل ہو گی ۔

گھریلو زندگی میں ماں باپ ، ابتدائی اساتذہ اور بعض ساتھیوں کا اثر بالکل قدرتی تھا ، ان میں سے بعض کا ذکر گزشتہ آچکا ہے ۔

بچپن میں سب سے زیادہ جن بزرگوں کا اثر قبول کیا ، اور جن کی تعلیم و تربیت سے مستفید ہوا وہ ذیل کی شخصیتیں ہیں :

• مولوی شبیر حسینؒ (میں نے ابتدائی دینی تعلیم چند ماہ ان سے سیکھی) ' مولانا محمد ابراہیم (جن کا علمی و تربیتی احسان سب سے بڑھ کر ہے) ' انھیں کی وجہ سے میں نے

دینی تعلیم کی ابتدا کی اور تاحیات ان سے استفادہ کرتا رہا، ان کے اس احسان کا اجر بس خدا ہی ان کو اپنی شان کے مطابق دے گا۔ حضرت رئیس القراء ڈاکٹر سید کلیم اللہ حسینی، فن قراءت میں نے جو کچھ سیکھا انھیں سے سیکھا، اس کے علاوہ وہ میرے محسن و مربی بھی تھے، اور ان کے علم و فضل سے ان کی آخری زندگی تک استفادہ کرتا رہا۔ اس زمانے کے ساتھیوں میں محبی مولانا الطاف حسین صاحب ہیں، جو میرے بڑے بھائی جیسے ہیں، ان کی ذات سے ہمیشہ استفادہ ہی کرتا رہا، اور ہر اچھے اور تعمیری کام میں ان کا مشورہ میرے لئے رہنمائی کا کام دیا۔

حافظ سید احمد حسینؒ سے کلام اللہ کے حفظ کی تکمیل کی، وہ میرے بیحد مشفق استاذ تھے اور مولانا عبد الحفیظ جنیدی جو کلام اللہ کے صحیح پڑھنے کی مشق کرواتے اور جامعہ نظامیہ میں راحت کا سامان فرماتے۔ قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ ادب اور دیگر دینی علوم جہاں سیکھے، وہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو ہے۔ وہاں کے سارے اساتذہ کا میں ممنون کرم ہوں، ان میں سے جن اساتذہ سے زیادہ استفادہ کیا وہ یہ ہیں : مولانا محمد رابع ندوی، مولانا سعید الرحمن ندوی، مولانا مفتی محمد ظہور ندوی، مولانا وجیہ الدین ندویؒ مرحوم، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ اور حضرت مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ۔ لیکن جو علمی نقش اور تعلیم و تربیت کا اثر حضرت علامہ سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے حاصل ہوا وہ سب سے بڑا اور عظیم ہے۔ ندوہ کی تعلیمی زندگی میں ان کی علمی سرپرستی، اور مالی اعانت اور ان کی ہر طرح کی شفقتیں میرے ساتھ قائم رہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو حسب مراتب اجر عطا فرمائے۔

روحانی عقیدت چند سال ان بزرگوں کی رہی : حضرت محمد محبوب حسین شاہ فاروقیؒ، مولانا سید عبداللہ شاہؒ، مولانا محمد حسام الدین حسامیؒ، مولانا شیخ محمد زکریا، مولانا سید محمد بادشاہ حسینیؒ اور مولانا محمد یوسف حضرتؒ۔

اور محسن شخصیتوں کی فہرست مکمل نہیں ہو سکتی جب تک یہ نام بھی اس میں

نہ شامل کر لئے جائیں : جناب محمد علی مدراسی ، جناب الحاج چودھری محمد برہان الدین صاحب مدراسی ، پروفیسر مولانا سید عبدالوہاب صاحب بخاری ، ماموں عبدالرحیم صاحب نلگنڈوی ، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف وائس چانسلر جامعۃ الملک عبدالعزیز جدہ ، قائد محترم سید خلیل اللہ حسینیؒ ، صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت اور منہ بولی اماں جان زینب بیؒ وغیرہ ۔

ہم عمر دوستوں اور ساتھیوں میں ، عزیز گرامی مولانا محمد عمران اعظمی عمری مصحح دائرۃ المعارف ۔ جن سے ہر طرح کا علمی استفادہ کیا ، مولانا مفتی عظیم الدین صاحب صدر المصححین دائرۃ المعارف اور مولانا محمد الطاف حسین صاحب مصحح دائرۃ المعارف ، ان سب کی رفاقت برسوں رہی ، ان کے اخلاص ، محبت اور علمی مشوروں کا میں ہمیشہ ممنون کرم ہوں ۔ اور عزیز شخصیتوں میں مولوی عتیق احمد ندوی رائے بریلی ہیں ، میں نے ان سے کچھ لیا اور شاید تھوڑا بہت دیا بھی ۔

دار العلوم الاسلامیہ بامریکا کے قیام میں جن حضرات کا نام قابل ذکر ہے وہ یہ ہیں ۔ جناب محمد اقبال صاحب ایم یس ، جناب ابو بکر بیٹھاوالا ، جناب عبدالرحمن میمن ، جناب عبدالرووف غازیانی ، جناب عبدالواحد عمر ، جناب عبدالرحیم سبادیا ، جناب شکیل پٹیل اور جناب محمد یوسف قاضی صاحب انجنیر ۔ اللہ ان سب کو اور دار العلوم کے قیام میں جنہوں نے دامے درمے ، سخنے مدد فرمائی ان کو بھی اپنی شان کے مطابق اجر و ثواب عطا فرمائے ۔ آمین ۔

دار العلوم کے قیام کے وقت میں (جماعت اسلام) اسلامک سوسائٹی سے مستعفی ہو گیا تھا ، اس زمانے میں میرے لڑکوں کی تجارت قائم نہ ہوی تھی ، اور نہ ہی ہندوستان کی جائیداد سے استفادہ شروع ہوا تھا ، ان حالات میں میری رفاقت و کرم فرمائی اور ہر طرح کی مالی اعانت میرے محترم دوست محمد ابراھیم واد ابھائی نے فرمائی اللہ انھیں جزائے خیر دے ۔ آمین ۔

عزیز شخصیتوں میں ان حضرات کا نام نہ لینا احسان فراموشی ہوگی : محمد عباس تایازاد بھائی، محمد اعظم قریشی (امریکہ) جن کی وساطت سے میں امریکہ پہنچا، مولوی علی عبید کربان (مکہ)، مکہ مکرمہ میں میرے میزبان، جن کی وجہ سے مکہ میں قیام، وطن کے آرام سے بدل جاتا ہے۔ اور جناب سید صداقت علی (مکہ) جو ہمیشہ مکہ مکرمہ کے قیام اور دیگر امور میں سہولت کا باعث بنتے ہیں، اور جناب صلاح صاحب کی پرتکلف دعوتیں یاد کے قابل ہیں۔

علمی و تصنیفی دنیا میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا احسان سب سے بڑا ہے، اس کے بعد دائرۃ المعارف العثمانیہ میں اس کی ترقی ہوی، اور وہاں کے علمی ماحول سے بہت کچھ سیکھا، لیکن میری زندگی میں جن کتابوں نے عظیم اثر پیدا کیا، جن کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے، وہ محسن کتابیں یہ ہیں رحمۃ للعالمین از مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری، سیرۃ النبیؐ از علامہ شبلیؒ و مولانا سید سلیمان ندویؒ۔ تاریخ دعوت و عزیمت اور مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر انسانی دنیا پر از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، تفہیمات و تنقیحات از مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفسیر قرآن مجید از مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور ان کے مضامین اور دیگر کتب، مختارات الادب از علامہ سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ وغیرہ۔

اردو ادبی و علمی تحریروں میں سب سے بڑے محسن میرے پڑدادا استاذ علامہ شبلی نعمانی ہیں، لکھنے پڑھنے کا انداز ان کی تحریروں کو پڑھ پڑھ کر سیکھا، غرض میری چھوٹی بڑی تصنیفی زندگی کی جان علامہ شبلیؒ ہیں۔ اس کے بعد لکھنے پڑھنے کا سلیقہ میرے دادا استاذ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحریروں سے سیکھا، محفلوں اور مجلسوں میں خطبات مدراس کے صفحوں کے صفحے یاد کر کے محفلوں کو خوب گرمایا، علمی و ادبی تحریروں کو رٹ رٹ کر اور اپنی تصانیف میں ہر جگہ اس کو پھیلایا، ان دو بزرگوں کی حیثیت ادبی و اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی ہے، جہاں ہر علمی و ادبی مشکل میں ان کو رہنما

بنایا جاسکتا ہے، اور میں نے ان کی تحریروں سے ہر طرح کا، اور سب سے زیادہ استفادہ کیا، گو میں نے ان بزرگوں کی صحبت نہیں پائی، لیکن علمی و ادبی فیض ان کی کتابوں سے حاصل کرتا رہا۔

ان دو بزرگوں کے بعد میں نے سب سے بڑھ کر علمی استفادہ اپنے محسن استاذ حضرت علامہ سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریروں اور تقریروں سے حاصل کیا، جو علمی و ادبی فیض، ان کی صحبت سے حاصل ہوا، اس کا اب اندازہ کرنا ہی مشکل ہے۔ حضرت ممدوح میرے محسن و مربی ہیں، استاذ محترم ہیں، اور پیر و مرشد ہیں، ان کے علوم و فیوض سے ہر طرح کا استفادہ کیا اور کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ذات بابرکات کو ہمارے سروں پر تادیر سلامت رکھے۔ آمین۔

ندوۃ العلماء کی طالب علمی کے زمانے میں "صدق جدید" پابندی سے پڑھتا رہا، اور گاہ گاہ دریا باد جاکر مولانا عبدالماجد دریا بادی سے ملتا رہا۔ ان کی کتابوں کے پڑھنے کا شوق اسی زمانہ سے شروع ہوا تھا "صدق جدید" کے بعد ان کی مایہ ناز تفسیر پڑھی، ان کے ادبی جملوں پر جھوم جھوم گیا، اور کوشش کی کہ ان کا انداز تحریر اپناؤں، وہ اس صدی کے ایک نامور ادیب تھے، ان کے علمی و ادبی مضامین سے میں نے بھرپور استفادہ کیا، ندوہ کی طالب علمی کے زمانے میں عربی تحریروں کا ترجمہ اور امتحانی پرچوں میں لکھنے کا خلاصہ ان کے ادبی اسٹائل پر کرتا تھا، میرا سب سے پہلا مضمون "ملیشیا میں دو ہفتے" ۱۹۶۴ء میں انھیں کی ادبی تحریروں کو اپناتے ہوئے لکھا تھا، جس پر بڑی داد و تحسین ملی تھی۔ اور میں نے ندوۃ العلماء کی زندگی کے بعد ادیب کامل، اور ایم۔اے (اردو) میں انھیں کے ادبی اسٹائل میں امتحانی پرچے لکھے، اور ہر ایک میں امتیاز حاصل کیا۔ اس کے بعد "نشریات قرآنیہ" کا سلسلہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے تقریباً ۱۵ سال تک چلا، ان کی تفسیر سے بیحد مستفید ہوا۔ اس کے علاوہ ان نشریات قرآنیہ میں مولانا مودودی صاحب کی تفسیر سے بھی استفادہ کیا۔

مقالات سیرت والے مضامین میں، سب سے زیادہ استفادہ علامہ شبلی و مولانا سلیمان ندوی کی سیرۃالنبی سے کیا، اور بعض علمی و ادبی استفادہ رحمۃ للعالمین از مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری سے اور استاذ محترم مولانا علی میاں مدظلہ کی کتاب نبی رحمت سے کیا، لیکن تحریر میں علامہ شبلی کے ساتھ ساتھ مولانا عبدالماجد دریا بادی کے انداز نگارش کی تقلید کی اور اب جب "آپ بیتی" لکھنے کا موقع آیا تو انھیں کی "آپ بیتی" کو اپنا رہنما بنایا، فہرست مضامین کی ترتیب بھی اسی کتاب سے قائم کی، دیباچہ سے بھرپور استفادہ کیا، اور ہر باب کے جو عمدہ جوہر میری زندگی کے کسی حصہ میں نظر آئے انھیں کے اسٹائل میں لکھا، اور بعض تحریریں "من وعن" انھیں کی آپ بیتی سے نقل کیں، لیکن میری "آپ بیتی" ان کی "آپ بیتی" سے بالکل مختلف ہے، لیکن بعض پہلو (باب) ان کی زندگی کا گویا میری ہی زندگی جیسا نظر آیا، مثلاً از دولجی زندگی والا باب گویا ۹۰ فیصد مجھ جیسا تھا، اس کو ان کی تحریروں سے مزین کیا، لیکن اپنے حالات و واقعات کو مدنظر رکھتے ہوے بعض ادب و انشاء کے جملے ایسے پسند آئے کہ ان کو قدرے بدل کر جوں کا توں نقل کیا جیسے: "ہائے وہ ماں کی گود میں جانے کی لذت! اب کیا بیان ہو وہ لذت جس کا بدل نہ جوانی کی گرمیاں دے سکیں، نہ بڑھاپے کی خنکیاں۔ اور "غضب کی حسرت ناک سچائی بھر دی ہے کسی نے اس مصرعہ میں ع دو دن کو اے جوانی، دیدے ادھار بچپن"۔ وغیرہ۔ غرض ان کی تحریروں کا چربہ اتارنے کی ہر طرح کوشش کرتا ہوں، لیکن اس عظیم الشان ادیب کی کچھ نقالی ہی ہو پاتی ہے، ان کی تحریر کا چربہ یا اسٹائل تو بہت بڑی چیز ہے۔

سب کے احسانات اپنی جگہ پر، لیکن حقیقۃ میری سیرت سازی میں سب سے زیادہ معین و موثر دو شخصیتیں ثابت ہویں۔ ان دونوں نے کہنا چاہئے کہ زندگی کا رخ ہی موڑ دیا، اگر ان دونوں بزرگوں کا فیض صحبت نہ نصیب ہوجاتا تو خدا معلوم کہاں کہاں اب تک بھٹکتا پھرتا۔

پہلا نام تو حضرت مولانا محمد ابراھیم شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے ۔ یہ میرے گویا محبوب تھے ، بچپن سے وہ میرے محسن و مربی تھے ، سرکاری اسکول سے دینی مدرسہ میں رہنا انھیں کی وساطت سے ہوا ، بغدادی قاعدہ سے حفظ و قراءات کے ہر مرحلہ میں ان کی دستگیری حاصل رہی ، تعلیم کے ساتھ تربیت کا پہلو اس قدر عمدہ تھا کہ دین کی محبت دل میں بیٹھ گئی ، بچپن میں جو کچھ سیکھا ، انھیں کی ذات سے سیکھا ، اگر بچپن میں ان کا فیض صحبت نصیب نہ ہوتا تو نہ جانے کس کس در کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ۔ مجھ کو بھی ان کی ذات سے شیفتگی ، درجہ عشق تک پہنچ چکی تھی ، ان کی نہ کوئی بات دل کو بری لگتی نہ ان کی کسی حیثیت سے بھی تنقید کرنے کو جی چاہتا ، یہی جی میں رہتا تھا کہ ان کے ہاتھوں کو چوم چوم لوں ۔ قرآن و سنت سے ان کی شیفتگی اعلیٰ درجہ کی تھی اور اللہ کے وعدوں پر ان کو شدت سے اعتماد تھا ، اخلاص و للہیت سے وہ بھرپور تھے اور علم و معرفت کے تو وہ گویا مخزن تھے ، سنت کی اتباع و پیروی حضرت جیسی میں نے کہیں نہیں دیکھی ، جوانی میں (چار مشہور سلسلوں سے) انھیں سے بیعت کی اور انھوں نے خلافت سے سرفراز فرمایا اور ان کے وصال تک انھیں کا دامن تھامے رہا ، غرض میرے لئے تو وہ ایک بے مثال شخصیت تھے ، امید ہے کہ قیامت میں جہاں اہل اللہ کو شفاعت کا اذن ملے گا تو وہ مجھے نہ بھولیں گے ، اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے ۔ آمین ۔

دوسری عظیم شخصیت جو میرے نصیب میں آئی وہ استاذ محترم مفکر اسلام علامہ سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی ہے ، حضرت کمالات ظاہری و باطنی کے مرکز ، علم و فضل میں علامہ کہلائے جانے کے لائق ، عرب و عجم کے معلم ہیں ، سینکڑوں کتابوں کے مصنف و مؤلف اور خاندانی شرافت کے منبع و مرکز ہیں ، شریعت و طریقت کے جامع اور حسن عمل کے زندہ پیکر ہیں ، غرض پہلی بار جب مدراس میں حضرت کو دیکھا تو سمجھا کہ میری مراد بن کر تشریف لائے ہیں ، دارالعلوم میں داخلہ کا پروانہ بھی وہیں

مدراس میں حضرت نے دیا، اور ندوہ کی طالب علمی کی پوری زندگی میں میری علمی و مالی سرپرستی فرماتے رہے، الحمدللہ اس کے بعد بھی تعلق قائم رہا، ہر مشکل مسئلہ میں انھیں سے رہبری ملی، اور اب بھی مجھے انھیں کے دامن سے وابستگی ہے۔ حضرت مولانا مرشدی محمد ابراھیم صاحبؒ کے وصال کے بعد اب انھیں سے بیعت کا شرف حاصل ہے۔ غرض حضرت والا کا علمی و روحانی فیض جاری ہے، اللہ تعالیٰ ان کو ساری دنیا کے لئے تادیر سلامت رکھے، حضرت مولانا محمد ابراھیم رحمۃ اللہ علیہ اگر میرے محبوب و مشفق تھے، تو حضرت مولانا علی میاں مدظلہ میرے مقتدیٰ و مطاع ہیں۔ وہ محبت کے مرکز تھے تو یہ عقیدت کے مرجع ہیں۔

OOOOO

باب (۳۴)

"نامی گرامی عظیم شخصیتیں"

اب ہم ان نامی گرامی شخصیتوں کا ذکر کرتے ہیں، جن کو ان سیاہکار آنکھوں نے دیکھا، ملاقاتیں کیں، ان میں سے بعض کی صحبتیں بھی حاصل رہیں، اور بعض کی تقاریر سن کر متاثر ہوا اور بعض کو دور سے دیکھ کر فرحت و سکون محسوس کیا، اگرچہ ان کی بھی بہت بڑی فہرست ہے، مگر یہاں ذکر صرف ان عظیم الشان شخصیتوں کا کروں گا جنھوں نے قوم و ملت کی دینی یا دنیوی خدمت کی، اور جن کی ذات سے قوم و ملت کو بڑا فائدہ پہنچا، اور جن سے مل کر یا سن کر میں متاثر ہوا کچھ بندگوں کے نام گزشتہ آپ نے پڑھے اور بقیہ نامی گرامی حضرات یہ ہیں :

شیخ کبیر حضرت مولانا حسین احمد مدنی، شیخ اکبر حضرت شاہ عبدالقادر رائے

پوریؒ ، مولانا ابوالکلام آزاد عالم دین اور آزادی ہند کے عظیم سپوت ، مولانا حفظ الرحمن صدر جمعیتہ العلمائے ہند ، مولانا عبدالماجد دریابادی ، اس صدی کے مشہور ادیب و مفسر قرآن ، مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث دارالعلوم سہارنپور (جو میرے استاذ بھی ہیں) ، مولانا مفتی رحیم الدین شیخ الافتا (جامعہ نظامیہ) ، مولانا مفتی ابوالوفاء افغانی ثم حیدرآبادی (مفتی اعظم ہند) ، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء ، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی سابق معتمد تعلیم ، مولانا مسعود علی ندوی صدر دارالمعارف اعظم گڑھ ، مولانا مفتی عتیق الرحمن (دہلی) (جو میرے کرم فرما و محسن تھے) ، مولانا فخرالحسن شیخ الحدیث دیوبند ، مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ، مولانا محمد یوسف کاندھلوی (سابق حضرت جی نمبر ۲) ، مولانا عبیداللہ (داعی مرکز نظام الدین جو میرے استاذ بھی تھے) ، مولانا رحمت اللہ (داعی کبیر مرکز) ، مولانا پالن پوری (داعی مرکز نظام الدین) ، پروفیسر مولانا عبدالوہاب بخاری مدراس (جو میرے کرم فرما اور محسن تھے) ، مولانا محمد حسام الدین حسامی حیدرآبادی (مصلح قوم حیدرآباد) ، مولانا احمد لاٹ (داعی و مبلغ مرکز نظام الدین ، جو میرے ندوۃ العلماء کے ساتھی ہیں) ۔

شاعروں میں جگر مرادآبادی (ندوہ میں اساتذہ کے مجمع میں شعر سناتے ہوئے انھیں دیکھا تھا) اور حضرت امجد حیدرآبادی ، بچپن کی زندگی میں ان کی شفقتیں اب تک یاد ہیں ۔ محسنوں میں چودھری محمد برہان صاحب مدراسی (میرے محسن) اور جناب عباس مدراسی (میرے محسن و مشفق) اور نواب یوسف علی خاں ، میرے محسن و کرم فرما اور ڈاکٹر عبدالمعید خاں ناظم دائرۃ المعارف اور مولانا ڈاکٹر عبدالستار خاں صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ ، والیان ریاست اور جاہ و منصب والوں میں : اعلیٰحضرت حضور نظام آصف سابع (والی ریاست حیدرآباد ، جن کا میں مدرسہ و کٹوریہ اور جامعہ نظامیہ میں نمک خوار رہا ، اور جنھوں نے مجھے خلعت و انعام سے نوازا) ۔

دوسری شخصیت محمد اسماعیل بادشاہ ملیشیا، ملیشیا کے عالمی مقابلہ کے بعد قراء کے اعزاز میں ایک عشائیہ میں ملاقات ہوی، وہ ہم سے بڑے اخلاق و محبت سے ملے۔ اور انھیں کے پاس ٹنکو عبدالرحمن صاحب وزیراعظم ملیشیا سے ملاقات ہوی۔ اور ہندوستان کے نامور بے تاج بادشاہ مسٹر نہرو سے ۱۹۶۴ء میں، ایک اعزازی تقریب میں ملاقات ہوی۔

OOOOO

باب (۳۵)

مخالفین و معاندین

مخالفین سے جب شخصی و نجی زندگی میں مفر نہیں تو پبلک زندگی میں آنے کے بعد ان کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوجانا بالکل قدرتی بات ہے۔ یہ کلیہ ایسا ہے جس سے مستثنیٰ دو چار کاملین بلکہ انبیاء بھی نہیں، جہاں مریدوں، معتقدوں میں مومنین کا گروہ پیدا ہوا، وہیں اعداء و معاندین بھی اسی درجہ میں پیدا ہوتے گئے۔

اپنی تنگ ظرفی اور کمزوری کی رعایت سے، الحمدللہ کہ مخالفین کی تعداد اپنی عوامی زندگی کے ہر دور میں نسبتاً بہت ہی کم رہی، مخلصوں، معتقدوں، حسن ظن رکھنے والوں کا شمار ان کے مقابلہ میں کہیں زائد۔ الحمدللہ ذاتی و نجی زندگی میں تو کہنا چاہیئے کہ کسی مخالف کا وجود نہیں۔ یہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ ورنہ کون ہے جو خانگی و خاندانی مخالفتوں کی وبائے عام سے بچا ہوا ہے۔

اختلاف رائے و خیال بالکل قدرتی ہے۔ اور جب تک انسان میں فہم و بصیرت اور مذاق کا اختلاف قائم ہے، ایسے اختلاف کا مٹنا ممکن نہیں، بلکہ بالکل ممکن ہے کہ ایسا اختلاف بھائی بھائی، باپ بیٹے، میاں بیوی اور مخلص ترین عزیزوں،

دوستوں ، محبوں کے درمیان بار بار ہوجائے ، تو ایسے اختلاف کا ذکر ہی نہیں ۔ "ولایزالون مختلفین" تو اللہ کا بنایا ہوا قانون تکوینی یہی ہے ، اور عجب نہیں کہ موجب برکت و رحمت ہو۔

سوچنے پر اس وقت چار واقعات یاد آتے ہیں ، ایک واقعہ عین نوخیز جوانی کا ، جب کہ مدراس میں میری شہرت بحیثیت حافظ و قاری عروج پر تھی ، ایک مسجد کے امام کو مجھ سے عداوت پیدا ہوی ، میرے مدراس کے چند دن کے غیاب میں اس نے افترا پردازی اور بہتان طرازی کر دی اور جب میں مدراس واپس آیا تو میرے ملنے جلنے والوں میں کچھ کشیدگی پایا ، جب میری بے چینی بڑھی تو تحقیق ہوی اور اس شخص کو ان کے سامنے طلب کیا گیا ، حقیقت حال کہنے کو کہا گیا ، اس نے اپنے جرم کا اقرار کیا ، جس کے بعد احباب میں خلوص و محبت کی راہیں کھلیں اور اس امام کو امامت سے ہاتھ دھونا پڑا۔

دوسرا واقعہ حیدرآباد میں میری شہرت کے عروج کے زمانہ کا ہے ، ندوہ سے فراغت کے بعد دوسرے سال عالمی مقابلۂ قراءت ملیشیا میں ، میں امتیازی کامیابی کے ساتھ واپس آیا اور ایک مضمون "ملیشیا میں دو ہفتے" کے عنوان سے لکھا ، اس پر بڑی داد و تحسین ہوی اور ہمارے فن قراءات کے استاذ حضرت رئیس القراء ڈاکٹر سید کلیم اللہ حسینیؒ کی اخباروں میں بڑی مدح و ستائش ہوی ۔ دوسرے گروپ کے قراء (یعنی امام القراء قاری میر روشن علی صاحبؒ کے شاگردوں) نے ہمارے خلاف ایک ہوا کھڑا کیا ، جس کا سر تھا نہ پیر ، وہ اور تو کچھ نہ کر سکے ، لیکن دائرۃ المعارف (جہاں میں کام کرتا تھا) کے ناظم صاحب کو گمنام خط لکھنے لگے سب کے سب فرضی ۔ اعتراض یہ تھا کہ ملیشیا کی قاریات جو اس مقابلہ میں شریک تھیں ان کا ذکر مضمون میں آیا ، اور ان کے خیال میں وہ بے ادبی ہے وغیرہ ، ناظم صاحب (ڈاکٹر عبدالمعید خاں مرحوم) بڑے سمجھدار آدمی تھے ، انھوں نے کوئی تعریض نہ کی ، تحقیق سے معلوم ہوا کہ امام القراء کے

گروپ کے کچھ ناسمجھ لوگ عورتوں کا لباس پہنے ۔ ان کی زبان میں لکھ رہے تھے اور وہ پکڑے گئے، عوام الناس میں ان کی سرزنش ہوی، اور ان کی رسوائی ہوی۔

تیسرا واقعہ بھی حیدرآباد ہی کا ہے کہ میں مقامی مسجد ودیانگر میں بعد نماز فجر ہفتہ میں ۶ دن، تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس باری باری سے دیا کرتا تھا، اور ایک مجمع کثیر اس میں شرکت کرنے لگا، بڑھتے بڑھتے سینکڑوں کی تعداد ہو گئی، ایک مقامی جماعت کے ذمے داروں کو حسد پیدا ہوا، اور وہ بہانے ڈھونڈتے رہے۔ اور ایک دن غنڈوں و بدمعاشوں سے حملہ کرایا، الحمدللہ خدا نے ہماری حفاظت فرمائی، اس واقعہ سے جس سے ایک وقیع جماعت پر (ان نادانوں کی حرکتوں کی وجہ سے) حرف آیا تھا، بات بڑھتے بڑھتے میرے محسن استاذ مولانا علی میاں ندوی مدظلہ تک پہنچی، اور غلط انداز سے پہنچائی گئی، دوسرے سال جب میں ۸۵ سالہ جشن ندوہ میں لکھنؤ پہنچا تو حضرت نے تنہائی میں اس کا ذکر فرمایا، میں نے حقیقت حال بتلائی حضرت نے مخلصانہ مشورہ کے بعد فرمایا کہ "جماعت کے کچھ نادان افراد سے جماعت پر حرف نہیں آتا" وغیرہ، اور دہلی مرکز کو صحیح حالت کی اطلاع دی گئی اور ان نادانوں کی سرزنش کی گئی۔

چوتھا آخری واقعہ (خدا کرے یہ واقعی آخری واقعہ ہو) یہ ہوا کہ، امریکہ میں ۱۹۸۸ء میں دارالعلوم الاسلامیہ بأمریکا کی، الحمدللہ میں نے بنیاد رکھی، اور دو سال میں دارالعلوم کی ایک بڑی عمارت کی تعمیر ہوی اور اس کے بعد الحمدللہ دو سال نہایت سکون سے دینی تعلیم ہورہی تھی کہ کچھ مقامی معاندین اور اعداء کی ایک جماعت جو تین آدمیوں پر مشتمل تھی، شرارتیں کرنے لگی، ان میں دو عرب تھے اور ایک پاکستانی، انھوں نے میرے خلاف طنز وتعریض، تحقیر وتنقیص، تضحیک و فضیحت کا ہر حربہ استعمال کیا، اور ان کا سرغنہ ایک بدنام زمانہ سینیا گو کا باشندہ ہے، اور معزز جماعت کی بدنامی کا سبب بنا ہوا ہے۔ ان سب افراد نے مقامی اخباروں میں غلط

افواہیں پھیلانے کی کوشش کی لیکن اللہ کے فضل سے اخبار والوں نے ان کو غلط سمجھ کر جو واقعی غلط تھیں شائع نہ کیں ۔ میں نے خدا سے فریاد کی کہ بارالہا ! یہ جو کچھ کر رہے ہیں آپ اس سے واقف ہیں، آپ ہی اس شر کو دفع فرما دیجئے ۔ کچھ ماہ بعد یہی لوگ شرمندہ ہوئے ۔ اس طرح اللہ نے مجھے ان کے شر و فساد سے بچالیا ۔ **فالحمد للہ علیٰ ذلک ۔**

یہ چند واقعات تھے جو ظہور پذیر ہوئے ۔ امریکہ میں آزادی ۔ خیال کی وجہ سے بعض جدید تعلیم یافتہ اور اہل ثروت لوگوں میں، میری صاف گوئی، اہل ثروت سے دوری، اور مسائل فقہ میں صحیح اور واضح فتووں کی وجہ سے بعض حاسدین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے، جو کھل کر تو سامنے نہیں آتا، بلکہ موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کسی طرح مجھے مشتعل کیا جائے اور ایک فتنہ کھڑا کیا جائے ۔ اللہ تعالیٰ سے ہر وقت شرور و فتن سے پناہ مانگتا ہوں ۔ **اللھم احفظنا من شرور أنفسنا ومن سیئات أعمالنا ۔ نعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق ۔** آمین ۔

خود مجھ سے بھی نہ معلوم کتنوں کو اذیت پہنچ چکی ہو گی، اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے ۔ بہرحال میں نے یہ چند سطریں ڈرتے ڈرتے لکھی ہیں، اور نیتوں کا حال تو عالم الغیب ہی پر روشن ہے ۔

○○○○○○

باب ۳۵ / ألف

اولاد

اولاد اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے، قرآن پاک نے ان کو "قرۃ أعین" فرمایا ہے، اللہ نے جہاں بیحد و حساب نعمتوں سے مجھے سرفراز فرمایا، وہیں اولاد کی نعمت بھی عطا فرمائی ہے۔ الحمد للہ اولاد کا سلسلہ شادی کے دوسرے سال ہی سے شروع ہو گیا تھا، شادی ۲۵/ اپریل ۱۹۶۴ء میں ہوی تھی، اور پہلی اولاد (لڑکی) تسنیم أمۃ الرحمن مارچ ۱۹۶۶ء میں پیدا ہوی، اور یہ سلسلہ ہر دوسرے سال جاری رہا یعنی دوسری اولاد (لڑکا) اگسٹ ۱۹۶۸ء میں پیدا ہوی، اس کا نام احمد محی الدین رکھا گیا۔ تیسری اولاد (لڑکا) مارچ ۱۹۷۰ء میں تولد ہوی، اس کا نام محمد حمید الدین رکھا گیا چوتھی اولاد (لڑکی) جون ۱۹۷۲ء میں پیدا ہوی، اس کا نام کوثر أمۃ الرحیم رکھا گیا، پانچویں اولاد (لڑکا) فروری ۱۹۷۴ء میں پیدا ہوی، اس کا نام حامد نجم الدین رکھا گیا، اور آخری ولادت مئی ۱۹۷۶ء میں ہوی، اس کا نام محمود فرید الدین رکھا گیا، اس کے بعد سے یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

الحمد للہ اولاد سے فطری محبت شروع ہی سے قائم رہی اور ہے، آخری ولادت کے بعد بھی اولاد کی آرزو و تمنا ہی رہی لیکن افسوس، اب کبھی وہ زمانہ لوٹ کر نہ آئے گا، اور نہ کبھی حمل کی خبر سننے میں آئے گی، اور نہ ہی کبھی زچگی کے قبل اور بعد کی خاطر داریاں اور خوشیاں میسر آئیں گی۔

عورت کا حسن و شباب بھی دنیا کی ہر مادی نعمت کی طرح کتنا عارضی، زود فنا اور پر فریب ہوتا ہے، ایک لکھنوی شاعر امیر علی رقم نے کتنا سچا مضمون باندھا ہے۔

تھی یہ حقیقتِ مجاز، اب یہ کھلا ہے جا کے راز
سب ہے فریبِ آب و گل، حسن و جمال کچھ نہیں

الحمدللہ اولاد چھ ہویں اور ماشاء اللہ وہ سب زندہ ہیں ، دو لڑکیاں اور چار لڑکے ، دونوں لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے ، اور دونوں صاحب اولاد ہیں ، الحمدللہ دونوں داماد نیک و صالح ہیں ۔ بڑی لڑکی تسنیم امۃ الرحمن ، ماشاء اللہ نیک ، اطاعت شعار اور سلیقہ مند ہے ، ان کے شوہر کا نام غوث محی الدین بیابانی ہے ، وہ دینی ضروری تعلیم سے واقف اور دنیوی تعلیم میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے بی ۔ کام ہیں ، اور اب وہ امریکہ میں تاجر پیشہ ہیں ، اور ابتدائی دنیوی تعلیم کے بعد لڑکی (تسنیم) کی (مولوی) کی تعلیم جامعۃ الصالحات مالیگاؤں میں ہوی ، تیسرے تعلیمی سال کے بعد امریکہ آگئی "مولوی" کی سند حاصل نہ کر سکی ۔ دوسرا اور تیسرا لڑکا احمد محی الدین اور محمد حمید الدین حافظ و قاری ہیں اور امریکہ میں ہائی اسکول کے گریجویشن کے بعد اب تجارت میں مشغول ہیں ۔

چوتھی اولاد (لڑکی) کوثر دینی و دنیوی (ضروری) تعلیم سے آراستہ ہے ، نیک و صالح اور سلیقہ مند ہے ، اور ان کے شوہر محمد ہارون رشید نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے (بی ۔ اس ۔ سی اور ام ۔ اے) کا امتحان پاس کیا ہے ، اور اب امریکہ میں تجارت کرتے ہیں ۔ پانچویں اولاد (لڑکا) حامد نجم الدین دینی ضروری تعلیم پوری کر کے امریکہ میں ہائی اسکول کے گریجویشن کے بعد اب تجارت میں مشغول ہے ، الحمدللہ یہ لڑکا تمام اولاد میں سب سے زیادہ سعادت مند ہے ، تعلیم کے ساتھ ساتھ گھر کی ذمہ داری اور دار العلوم الاسلامیہ کی ہر طرح خدمت کرتا ہے ۔

آخری اولاد محمود فرید الدین نے امریکہ کے ہائی اسکول کے گریجویشن کے بعد ، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے "عالمیت" کا ایک سال پورا کیا ، پھر صحت کی خرابی کی وجہ سے امریکہ چلا آیا ، امید ہے کہ ان شاء اللہ جامعۃ أم القریٰ مکۃ المکرمۃ میں امسال ۱۹۹۶ء میں "عالم" کے کورس میں داخلہ لے کر وہ دینی تعلیم کو مکمل کرے گا ، پھر ان شاء اللہ امید ہے کہ دار العلوم امریکہ میں دینی خدمات انجام دے گا ۔

الحمدللہ ہماری خانگی زندگی عافیت سے گزر رہی ہے، باقی عافیت اصلی تو بجز جنت کے اور کہاں نصیب ہو سکتی ہے، دنیا بہرحال دنیا ہے، الحمدللہ مسرت اس کی ہے کہ اس وقت تک جو نسل چھوڑے جارہا ہوں وہ مومن اور مسلم ہے، آئندہ ان کو اور اس کے بعد کی نسل کو سنبھالے رکھنا اور دولت ایمان پر قائم رکھنا اس قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کی ذات سے امید ہے کہ وہ ہم سب کو صحیح اسلام کی زندگی نصیب فرمائے گا اور ایمان کی حالت میں موت دے گا۔ اور ہم کو اور ہماری ساری نسل کو تاقیامت مومن و مسلم رکھے گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔ اور آپ سے گزارش ہے کہ آمین کہیں۔ آمین۔

OOOOO

باب (۳۶)

دینی تحریکیں اور ان سے اثر پذیری

تبلیغی جماعت :

الحمدللہ، بچپن ہی سے گھر کا ماحول دینی و مذہبی تھا، پھر حفظ کلام اللہ کے لئے جامعہ نظامیہ حیدرآباد دکن میں وقت گزرا، مدراس میں پڑھتا اور پڑھاتا رہا، پھر ندوۃ العلماء میں علم دین کی تکمیل کی، غرض دینی تحریکوں میں اس پوری زندگی میں شرکت کا موقع نہ ملا، اور کبھی ملا بھی تو تھوڑی مدت کے لئے ملا۔

جب میں دس سال کا تھا تو پہلی بار میں نے تبلیغی جماعت کا نام سنا، اس جماعت کے کچھ لوگ حیدرآباد میں چارمینار سے شاہ علی بنڈہ کی طرف رواں دواں پیدل جارہے تھے، جس میں مولانا عبدالستار خاں صاحب صدر مصحح دائرۃ المعارف، مولانا رحمت اللہ صاحب (مرکز) دہلی والوں کے ساتھ ایک جماعت تھی۔

مدراس کی طالب علمی اور معلمی کے زمانہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب اور مولانا عبدالملک صاحب کی ایک جماعت مدراس پہنچی، اور ضلع ڈنڈیگل مدراس میں ایک عظیم الشان اجتماع ہوا، اس اجتماع میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی عالمانہ تقریر سے بیحد متاثر ہوا، اللہ نے ان کی زبان میں بڑی تاثیر دی تھی ۔ اللہ ان پر خصوصی فضل فرمائے اور اپنی صفت ستاری سے ان کو محشر میں ستر کے ساتھ جنت الفردوس میں جگہ دے ۔

پھر ندوۃ العلماء میں داخلہ سے ایک ماہ قبل حیدرآباد کے ایک تبلیغی اجتماع میں مولانا پالن پوری صاحب کی تقریر نے دل کو ہلا سا دیا، اس وقت میری عمر ۱۸ سال تھی، جناب کرنل سید امیرالدین صاحب نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ میرے ایک چلہ کی تشکیل فرمادی ۔ اسی چلہ کی جماعت کے ساتھ دہلی روانہ ہوا، مرکز پر (حضرت جی) مولانا محمد یوسف صاحب کی تقریر نے متاثر کیا، اور مولانا عبیداللہ صاحب کی رفاقت، دہلی و نواح دہلی میں خوب رہی، اللہ نے ان کو قرآن و حدیث کے علوم میں بڑا عبور عطا فرمایا تھا، ان سے بڑا استفادہ کیا، پھر بلند شہر، آگرہ، علیگڈھ اور کانپور سے ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچا ۔ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مسلسل پانچ سال علم دین میں مصروف رہا ۔

ندوہ سے فراغت کے بعد پڑھنے پڑھانے اور تصنیف و تالیف کی مصروفیتوں نے جماعت میں نکلنے کا موقع نہ دیا ۔ گاہ گاہ جماعت سے وابستگی ضرور رہی، جو کبھی ختم نہ ہوی ۔ امریکہ کے قیام میں بھی جماعت سے وابستگی باقی رہی، جماعت کے اجتماعات میں شرکت تو لازمی طور پر ہمیشہ رہی اور رہتی ہے اور مقامی طور پر نصرت بھی کرتا رہتا ہوں ۔ لیکن چلہ، تین چلہ اور ایک سال والی جماعت میں نکلنے کی توفیق اب تک نہیں ہوی ۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ اس کی بھی توفیق عطا فرمائے ۔ غرض جتنی دینی تحریکیں میں نے دیکھی ہیں، ان میں تبلیغی جماعت اور کل ہند مجلس تعمیر ملت نے مجھ

کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔

۱۹۸۶ء میں ڈٹرائٹ (امریکہ) کے عالمی اجتماع میں شرکت ہوی، لیکن یہ صرف شرکت تھی۔اور اپریل ۱۹۹۶ء میں، آسٹریلیا کے عالمی اجتماع میں شرکت کی سعادت حاصل ہوی، اس سفر میں اس جماعت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا (خوبی اور خرابی ہر جماعت میں موجود ہے)، لیکن خوبیوں کا اجتماع اس جماعت میں بھرپور پایا۔وہاں سے نیوزی لینڈ اور جزیرہ فیجی ہوتا ہوا امریکہ پہنچا۔یہ بھی صرف نصف چلہ تھا، پورا چلہ نہ تھا، غرض امریکہ کے ہر بڑے چھوٹے اجتماع میں شرکت سے ایمان تازہ کرتا رہتا ہوں اور اس جماعت کی نصرت بہرحال نصیب میں آگئی ہے۔اب نصرت سے ہجرت کی طرف قدم اٹھ رہا ہے، خدا کرے یہ بھی نصیب ہوجائے۔اس جماعت کی صحبت میں خوبی یہ ہے کہ "ایمان" میں حلاوت کی چاشنی ملتی رہتی ہے۔اور "**زادتھم ایمانا**"، "**وجلت قلوبھم**" کی کیفیت قلب پر طاری رہتی ہے۔

تبلیغی جماعت کے سلسلہ میں اس جماعت کا خلاصہ مولانا ابوالکلام آزاد کی زبانی کہے دیتا ہوں، مسٹر نہرو نے جب جماعت اسلامی ہند کو (BAN) کیا تو تبلیغی جماعت پر مولانا ابوالکلام آزاد سے مشورہ چاہا، مولانا آزاد نے فرمایا: "تبلیغی جماعت کا پیغام زمین کے نیچے کی زندگی اور آسمان کے اوپر کی زندگی کے متعلق ہے"۔اور نہرو سے کہا کہ تم کو اس جماعت کے متعلق کسی قسم کی تشویش کی ضرورت نہیں ہے۔ غرض، مسلمان کو برزخ اور آخرت کی زندگی کی فکر کرنی چاہیئے، اور برزخ آخرت کی زندگی کی پہلی منزل ہے اور رہی دنیا تو یہ فنا ہونے والی ہے۔"**ما عندکم ینفد وماعنداللہ باق**"۔

آخر میں مسلمانان عالم سے گزارش ہے کہ، اس جماعت کے سلسلہ میں مفکر اسلام استاذ محترم حضرت علامہ سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی ایک اہم اور مفید نصیحت یاد رکھیں، حضرت نے تبلیغی جماعت کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ

نے تبلیغی جماعت کو قبول فرمالیا ہے، اگر اس جماعت کو اللہ کی طرف سے قبولیت نہ ہوتی تو یہ سارے عالم میں نہ پھیلتی۔ اس لئے میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اس جماعت میں کچھ وقت ضرور لگاؤ، اس کا تمہیں یقیناً فائدہ ہی حاصل ہوگا، اگر کسی وجہ سے نکلنا نہ ہو تو تم اس جماعت کی نصرت کرو، اور اگر یہ دونوں چیزیں بھی نہ ہو سکیں تو اس کے لئے دعائے خیر ہی کر دیا کرو۔ اور فرمایا کہ یاد رکھو! اگر ان مذکورہ باتوں میں کوئی بھی تم نہ کر سکو اور تمہیں کسی وجہ سے یہ جماعت پسند نہ آئے تو خدارا! اس کی مخالفت ہرگز مت کرو کیونکہ مخالفت میں پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔

جماعت اسلامی

جماعت اسلامی کا نام پہلی بار ندوۃ العلماء کی تعلیمی زندگی میں سنا، ندوہ سے فراغت کے بعد حیدرآباد میں ان کے ہفتہ واری اجتماع میں بھی کبھی کبھی شرکت کی، اور ایک عالمی اجتماع جو حیدرآباد ہی میں ۱۹۷۶ء میں ہوا تھا، اس میں تین دن رہ کر قریب سے اس جماعت کو دیکھا اور بعض بزرگ شخصیتوں سے ملاقات کی جن میں مولانا ابو اللیث ندوی سے بڑا متاثر ہوا، اور حیدرآباد کے امیر مولانا لطیفی صاحب کریم نگری کی ذات سے ایک عرصہ تک تاثر قائم رہا، اسی زمانہ میں مولانا مودودی صاحب کی بعض اہم کتابوں اور تفسیر کا مطالعہ کیا، اور تفسیر میں بعض امور پر ان سے خط و کتابت بھی کی، ان کے جوابات سے مجھے تشفی نہ ہوی۔ مرحوم کی دینی خدمات سے ہم کو قطعی انکار نہیں، لیکن ان کی اس دوکان میں "دوائے دل" مجھے نہ مل سکی۔

اس جماعت میں جو خوبی میں نے پائی وہ انتظامی صلاحیت (ORGANIZATION) کی پائی۔ امریکہ جب پہنچا تو یہاں کی سب سے بڑی اسلامک سوسائٹی (ISNA) کو جماعت اسلامی کا قالب اوڑھے دیکھا، گو بعد کو وہ (ICNA) کی صورت میں علحدہ ہوی، لیکن ان دونوں

ORGANIZATIONS کا نام تو بدل گیا ہے، لیکن فکر اور رنگ نہ بدلا۔ ان دونوں مکتب فکر کے اجتماعات میں بارہا شرکت کا موقع ملا (ICNA) میں تو کم، لیکن (ISNA) کے اجتماعات میں زیادہ، اور کئی بار ان میں میری تقاریر بھی ہوئیں، اور ان کی بعض اہم ذمہ داریوں کو اعزازی طور پر قبول بھی کیا اور دینی خدمات بھی انجام دیں۔ ان کو بعض اہم مشورے بھی دیتا رہا، لیکن انھوں نے کبھی بھی ان پر کان دھرنے یا عمل کرنے کی زحمت نہ کی اور نہ ہی کسی مجبوری کا ذکر کیا۔ اس جماعت میں دنیوی لحاظ کے پڑھے لکھے لوگوں کو خوب پایا، گفتار کے غازی بہت دیکھے، لیکن کردار کے غازی کم ملے۔ دین کو مغرب کی عینک سے دیکھنا اور پڑھنا، مغربی تہذیب و تمدن کو سرتاپا اوڑھے رہنا، آزاد خیالی، مردوں اور عورتوں کا اختلاط، دین میں تحریف، اور گناہ کبیرہ جیسے بعض امور میں ملوث ہونا اور طرفہ تماشہ یہ کہ اس کو عین دین سمجھنا، اس تحریک (ISNA) میں عام ہے۔ اللہ امت کی حفاظت فرمائے۔ اور ہم سب کو نیک ہدایت دے۔ آمین۔

کل ہند مجلس تعمیر ملت

بچپن میں اس "مجلس" کو "بزم احباب" کے نام سے سنتا رہا، پھر ہر سال "رحمۃ للعالمین" کے عظیم الشان جلسوں میں اس جماعت کے بانی قائد محترم سید خلیل اللہ حسینی صاحب کو تقاریر میں گرجتے دیکھا، اس وقت صرف یہ سمجھا کیا کہ یہ جماعت صرف سالانہ ایک سیرت کا جلسہ کرتی ہے بس۔ ندوۃ العلماء سے فراغت تک اس جماعت سے تعلق نہ پیدا ہو سکا۔ ۱۹۶۴ء سے ان کے ہفتہ واری اجتماع میں گاہ گاہ جاتا رہا، اور اکثر کلام پاک کی، ان جلسوں میں "تلاوت" کی سعادت حاصل کی۔ ۱۹۷۴ء سے باضابطہ اس جماعت سے تعلق پیدا ہوا، اور قریب سے اس جماعت کی (ACTIVITIES) کو دیکھنے کا موقع ملا، قائد محترم جناب سید خلیل اللہ حسینی

صاحب کی لمعان افروز تقاریر سننے کی توفیق ہوی اور معلوم ہوا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں" ان کے عزم و ارادہ کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا، دبلا جسم، پیر میں لڑکھڑاہٹ لیکن آسمان جیسی عزیمت، اخلاق کا پتلا، دین کا درد رکھنے والا، سب کچھ کھو کر اسلام کو دینے والا، جبروت حکومت سے لڑنے والا، حق گو اور عزم کا پہاڑ، میں نے ایسا "مرد مومن" نہیں دیکھا۔ جب تعلقات بڑھتے گئے تو ان کی لمعانی و خاندانی خوبیاں عیاں ہونے لگیں، عزم و ارادہ کے تو یہ بادشاہ تھے ہی نظم و ضبط اگر کسی چیز کا نام ہے تو یہ "خلیل اللہ" کی وراثت تھی۔

اس زمانے میں اس اللہ کے خلیل کو دو جگہ دیکھتا رہا تھا، ایک تو انوار العلوم کالج میں جہاں میں لکچرر و صدر شعبۂ عربی تھا، اور وہ پرنسپل تھے۔ مجلس انتظامی ہو یا سینیر لکچرس کی محفل کیا مجال جو ان کے سامنے کوئی دم مارے، اجلاس سے باہر کلاسس کا دورہ "لڑکھڑاتے" ہوے جب وہ کرتے تو کیا طلبا، اور کیا لکچرس سب کے سب اپنے اپنے آشیانوں میں چھپ جاتے۔

دوسری جگہ روزانہ تعمیر ملت کے مرکز پر، یہاں میں ان کا چھوٹا بھائی جیسا، اور وہ اپنے لوگوں میں جیسے "رحماء بینھم" کی صفت سے آراستہ، الحمد للہ ان کی صحبت سے میں نے بہت کچھ سیکھا، اللہ تعالیٰ ان کے مرقد پر نور افشانی فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔ بابری مسجد کے انہدام سے ایک دن قبل ان کا انتقال ہوا، اور اس طرح اللہ نے ان کو ایک جانکاہ صدمہ سے محفوظ رکھا۔

غرض کل ہند تعمیر ملت، مسلمانوں کی ایک مخلص جماعت ہے، جو مسلمانوں کے درد و غم کو اپنا درد و غم سمجھتی ہے۔ بیکسوں کی دستگیری پر ہمیشہ سب سے آگے رہنا، فسادات کے مواقع پر ہندوستان کی حکومت سے نبرد آزما ہونا، اور مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنا، حکومت کی غلط پالیسیوں پر نکتہ چینی اور ان کی اصلاح کا بیڑا اٹھانا، مسلمانوں کو عزم و حوصلہ دلانا، اور ان کے بھولے ہوے سبق کو یاد دلاتے

رہنما، اس " مجلس " کے نمایاں اور عظیم الشان کارنامے ہیں، اس بزم کے دو جیالے اور مخلص رہنما جناب عبدالرحیم قریشی اور جناب سلیمان سکندر صاحب کا یہاں ذکر میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں، ان بزرگوں کے ساتھ رہ کر میں نے بہت کچھ سیکھا، اور دوسروں کو سکھایا، ان کا اخلاص و محبت ہمیشہ مجھے یاد رہے گا، امت کے لئے ان کی فکر اور تڑپ کو گویا میں امریکہ میں بیٹھ کر دیکھ رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں ۔ اللہ ان مخلصوں کو تادیر سلامت رکھے، اور امت مسلمہ کی خدمت ان کی سعادت بنی رہے ۔ آمین ۔

کل ہند مجلس تعمیر ملت نے حیدرآباد میں نشاۃ ثانیہ کا کام انجام دیا، حفاظت خود اختیاری (جو قرآن پاک کی تعلیمات کا جز ہے) کا سبق امت کو یاد دلایا، جس کی وجہ سے " کفر و شرک " لرزنے لگا۔ مسلمانوں میں قرآن و حدیث کی تعلیم کے ذریعہ ایک نئی بیداری پیدا کی، سیرت پاک کی محفلوں کے ذریعہ امت کی سیرت سازی کی، غیر مسلموں میں دعوت اسلام کی تبلیغ کی، علامہ اقبال کے ایمان افروز کلام سے مسلمانوں میں ایمان کی گرمی پیدا کی ۔ اسلام کی اشاعت میں لٹریچر تیار کروائے، وہ مسلمان جن کو مرتد کیا جارہا تھا، ان کو اسلام کے دائرہ میں دوبارہ لے آئے، اور مبلغوں کا ہندوستان میں ایک عظیم الشان جال پھیلادیا، ہندوستان میں آپسی نفرت و عداوت کو کم کیا، اور ظالموں کو ظلم سے روکا، اور اسلام کے دائرہ کو وسیع کرنے کے لئے دارالمبلغین کو قائم کیا، اور اس تنظیم کے تحت اسلام کی تبلیغ غیر مسلموں میں کرتے رہے اور کر رہے ہیں، اور نو مسلموں کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا جہاں قیام و طعام کے ساتھ ان کی تعلیم و تربیت کا بیڑا اٹھایا گیا ہے (غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت اور دارالمبلغین کی تاسیس کا جو اسی تعمیر ملت کے تحت انجام پائی، تفصیل سے " غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ " کے عنوان سے اسی کتاب میں، میں ایک علحدہ باب قائم کروں گا اس کو آپ ملاحظہ فرمائیں) ۔

غرض، امریکہ آنے کے بعد اس مجلس سے وہ ربط نہ رہا جو حیدرآباد دکن میں تھا لیکن میں ہمیشہ تعمیر ملت اور اس کے کام کو عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اور اس کے لئے اور اس کے نمائندوں کے حق میں دعا کرتا رہتا ہوں۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

باب (۳۷)

غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ

غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ لابدی ہے، حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم النبیین ہیں، اس لئے دعوت کا کام تاقیام قیامت امت کے سپرد کیا گیا، قرآن پاک کی بیسیوں آیات میں اس کا ذکر ہے "**کنتم خیر أمة أخرجت للناس**" "**ولتکن منکم أمة یدعون الی الخیر**" والی آیات میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" ساری انسانیت کے لئے عام ہے۔ "**أحسن الخیر**" "لمان" ہے۔ **شر الشرور** "شرک و کفر" ہے اور یہ دعوت ساری انسانیت کے لئے ہے، ہاں یہ بھی ضرور ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح و تذکیر بھی ہمیشہ ہوتی رہے جس کو قرآن پاک میں "**وذکر فان الذکریٰ تنفع المؤمنین**" فرمایا گیا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنھم جب دنیا میں پھیلے تو اس کام کو کرتے رہے، تابعین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے بھی اس کام کو پوری قوت لسانی کے ساتھ انجام دیا، کیونکہ اس زمانہ میں اسلام کا غلبہ تھا، اور اخلاق حمیدہ کی ہزاروں مثالیں سامنے تھیں، اس لئے لوگ اسلام میں "فوج در فوج" داخل ہوتے رہے، اس کے بعد اسلام کی قابل فخر شخصیتیں اس کام کو انجام دیتی رہیں اور ہر زمانے میں داعیوں نے اسلام کی تبلیغ میں کسی بھی طرح کی کسر اٹھا نہ رکھی۔ انھیں "اولیاء اللہ" اور مخلص داعیوں کی

کاوشیں تھیں کہ آج سارے عالم میں اسلام پھیلا اور پھیل رہا ہے۔

جس طرح مسلمانوں میں "تذکیر و اصلاح" کے کام ہو رہے ہیں ویسے ہی ایک "دعوت و تبلیغ" کی عالمی سطح پر جماعت کی ضرورت ہے، جو اسلامی اخلاق کا نمونہ بن کر اور اپنی ہر صلاحیت کو اسلام کے لئے لگا کر، اس مبارک کام کو انجام دے۔ جس طرح اللہ کے ایک نیک بندے حضرت مولانا محمد الیاسؒ "اصلاح و تذکیر" کے کام کو لے کر اٹھے، اور ان کے مخلصانہ کام کو اللہ نے سارے عالم میں مقبولیت عطا فرمائی۔ اسی طرح آج امت ایسے چند مخلصوں کی متلاشی ہے، جو تن من دھن کی قربانی کے ساتھ، عالمی سطح پر غیر مسلموں میں تبلیغی کام کو انجام دیں۔

ہندوستان میں اس طرح کی قربانی والا کام حضرت معین الدین چشتیؒ اور ان کے سلسلہ کے اہل اللہ نے خوب انجام دیا اور ان کے علاوہ سینکڑوں نامی گرامی داعیوں نے اس کام کو انجام دیا تھا۔ اور ان کے بعد بھی اللہ کے مخلص بندے اس کام کو انجام دیتے رہے۔ اور اس تبلیغ و ارشاد والے کام کو کل ہند مجلس تعمیر ملت حیدرآباد دکن نے ۱۹۷۵ء میں شروع کرنے کا عزم کیا تھا، جس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

قائد محترم سید خلیل اللہ حسینی صاحبؒ صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت ایک عرصہ سے "غیر مسلموں میں اسلام" کی تبلیغ کا پروگرام بنا رہے تھے، لیکن روبہ عمل لانے کی صورت نظر نہ آ رہی تھی، ایک بار انھوں نے مجھ سے اس کا ذکر کیا یہ میرے دل کی بات تھی، میں نے کہا کہ اس کام کو میں ایک تنظیم کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے فوراً کچھ اہل علم و فضل کو ایک عظیم اجتماع میں مدعو کیا، اور اپنی صدارتی تقریر میں ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت "ایمان" ہے اور اس کی دعوت ہر انسان تک پہنچانا ضروری ہے، اور اس کا مکلف اللہ نے ہم کو بنایا ہے، بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ پہلے مسلمان، صحیح طور سے مسلمان بن جائیں، تب اس کام کو کیا جائے، یاد رکھو اس طرح کا زمانہ قیامت تک نہ آئے گا، جس طرح آج مسلمان کا

ایمان کمزور ہورہا ہے ویسے ہی کفر و شرک کی قوت بھی کمزور ہے ۔ اب کچھ اللہ کے بندے کھڑے ہوجائیں اور اس کام کو انجام دیں " ۔ پھر اس کام کو کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، جن کا میں (غوث ندوی) کنوینر مقرر ہوا۔ تبلیغ کی اہمیت پر ایک مضمون " تبلیغ اسلام اور ہماری ذمہ داری " اسی کتاب میں آرہا ہے ۔

سب سے پہلے " غیر مسلموں میں اسلام " کی تبلیغ کے لئے تین احباب ورنگل کے سفر پر نکلے اور وہ یہ تھے : مولوی عبدالحکیم، مولوی عبدالکریم اور احقر محمد غوث ندوی (امیر جماعت)، طے یہ پایا کہ سب سے پہلے یہ دعوت اسلام ان لوگوں کے سامنے پیش کی جائے، جن کو حضرت بہادر یار جنگ مرحوم نے مسلمان بنایا تھا، اور اب ان میں کے اکثر دنیوی اغراض کی وجہ سے مرتد ہوگئے تھے ۔ ہم ورنگل کے ان مضافات میں جہاں لوگ مرتد ہوگئے تھے اس دعوت کو لے کر نکلے، اور ان کے سامنے دعوت اسلام پیش کی، اللہ کے فضل سے سینکڑوں نے دوبارہ اسلام قبول کرلیا، اور اپنی کم عمر اولاد کو ہمارے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا کہ ان کی تعلیم و تربیت کی ہم ذمہ داری قبول کریں ۔ اس مبارک سفر کی کامیابی کے بعد ہمارے حوصلے بڑھ گئے ۔

اب دوسرا سفر نلگنڈہ کا طے پایا، اس سفر میں پانچ افراد کی ایک جماعت تیار ہوئی، احقر کو امارت کے فرائض سپرد کئے گئے، یہ میرا اپنا وطن بھی تھا، اور یہاں دعوت اسلام میں ایک قسم کا جوش بھی تھا کہ میں اپنے " ہمسایہ " غیر مسلموں کو ایمان کی دعوت دے رہا ہوں ۔

طریقۂ دعوت یہ اختیار کیا گیا تھا کہ جماعت، مرکز تعمیر ملت حیدرآباد سے دو رکعت نماز پڑھ کر نکلی اور نلگنڈہ کی جامع مسجد (مسجد تعلقہ داری) میں ٹھیری، بعد نماز عصر تا مغرب خصوصی احباب سے ملاقات کی گئی اور مغرب کے بعد عام و خاص مسلمانوں کے سامنے خطاب کیا گیا ۔ اور ہمارے آنے کی غرض و غایت سمجھائی گئی، ہر شخص نے کام کو سراہا، اور کہا کہ یہ بہت ضروری ہے، لیکن ساتھ دینے سے، بجز ایک دو

کے سب نے انکار کیا، ماحول کے نہ ہونے کی وجہ سے، ان کا انکار بجا تھا، دوسرے دن صبح بعد فجر تقریر کی گئی، پھر دوبارہ ہمارے ساتھ تبلیغ کے کام میں شرکت کی دعوت دی گئی، اشراق کے بعد گھر گھر "کفار و مشرکین" کو دعوت اسلام دی گئی، دروازہ پر کھٹکا دے کر انھیں اسلام کی دعوت دی جاتی۔ اور جو لوگ سنتے انھیں لٹریچر بھی دیا جاتا، اور ایک جگہ بعد عصر جمع ہونے کی دعوت دی جاتی، بعض لوگ اسلام کی بات سن کر دروازہ بند کر لیتے تو انھیں اسی حالت میں چھوڑ دیا جاتا۔

ناشتہ کے بعد مختلف بازاروں میں قوم کو للکارا گیا، اور "ایھاالناس قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا" کی آواز لگائی گئی، سینکڑوں کا مجمع تھا، ہندو جمع ہوے، ہماری توحید والی بات کو سن کر وہ تعجب کرتے اور بعض کہتے کہ "ایک خدا ہی صحیح بات ہے"۔ اور بعض باطل خداؤں کی بے بسی سنتے تو ناک بھوں چڑھاتے۔ پھر دوسرے بازار کا رخ کیا گیا۔ پھر بس اسٹینڈ پر بات کھل کر کی گئی، یہ سلسلہ تبلیغ ظہر تک جاری رہا۔ بعد ظہر کھانے کے بعد کچھ آرام کیا، پھر بعض ہندو ڈاکٹر، انجنیر اور پڑھے لکھے لوگوں سے خصوصی ملاقاتیں کیں۔ الحمدللہ ایک ڈاکٹر رائیلو ریڈی نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا اور اس کا نام محمد عمر رکھا گیا۔ پھر عصر بعد بعض ہندوؤں کے اجتماع میں خطاب کیا گیا، خطاب کبھی عربی، اردو اور تلگو میں ہوتا اور کبھی اردو و تلگو میں، اس اجتماع میں ۴ ہندوؤں نے اسلام قبول کیا، اور ان سب سے مغرب بعد مسجد تعلقہ داری میں عام خطاب کے بعد مسلمانوں کے سامنے "شہادت اسلام" لی گئی یعنی توحید و رسالت کی شہادت، اور مسلمانوں کو ان نو مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی گئی۔ اسلام میں داخلہ کے واقعات ہمارے جانے کے بعد بھی ہوتے رہے، اور ان کو مرکز کل ہند تعمیر ملت حیدرآباد پر تعلیم و تربیت کے لئے بلوایا جاتا رہا، اس دورہ کے بارے میں ایک مضمون "روداد تبلیغی سفر" اسی کتاب میں شامل کیا

جارہا ہے۔

یہ سلسلہ، تبلیغ و ارشاد کوئی تین سال تک جاری رہا، اس درمیان میں حیدرآباد کے دیہاتوں میں خوب کام کیا گیا، اور سینکڑوں ہندو اسلام میں داخل ہونے لگے، اب مسئلہ یہ تھا کہ جو مسلمان ہو رہے ہیں ان کی تعلیم و تربیت کیسے کی جائے، ان کو کہاں رکھا جائے اور ان نو مسلموں میں بعض کو ان کے والدین نے گھر سے نکال دیا تھا، ان مسلمانوں میں نوجوان لڑکیاں بھی تھیں، اب سوال پیدا ہوا کہ ان کو کہاں رکھا جائے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل فرمایا، کہ اسباب غیب سے پیدا ہونے لگے، ان نو مسلموں کو دینی تعلیم و تربیت دی گئی، لڑکیوں (عورتوں) کو علحدہ رکھا گیا، ہر ایک کے معاش کے لئے ایک سلائی کی مشین دلوائی گئی، مردوں کو مختلف فنون کی تربیت دی گئی، اور معاش سے لگایا گیا، ان لڑکوں اور لڑکیوں کی آپس میں شادیاں کی گئیں، اور بعض مسلمانوں نے ان نو مسلم لڑکیوں سے شادی کی، یہ تمام باتیں ہوتی رہیں لیکن مسلمان (خاندانی - وراثتی مسلمان) خائف تھے کہ نہ معلوم حکومت مسلمانوں کے خلاف کیا جوابی اقدام کرے۔

۱۹۷۶ء میں تعمیر ملت کے تحت "دارالمبلغین" کا قیام عمل میں آیا، اس ادارہ میں نو مسلموں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ اور مسلمانوں کو دعوت کی ٹریننگ کے لئے ایک عمدہ نصاب تیار کیا گیا، اور احقر کو اس کا پرنسپل مقرر کیا گیا، اور نامی گرامی اساتذہ اس میں مقرر کئے گئے، مثلاً مولانا محمد عمران اعظمی عمری، مولانا الطاف حسین، مولانا عبدالحکیم اور جناب حامد غوری ام - اے وغیرہ۔ جس سے اس ادارہ کو بڑی تقویت پہنچی۔

۱۹۷۷ء میں نو مسلم بچوں کے لئے مولا علی میں ایک مستقل مدرسہ قائم کیا گیا ورنگل سے اور دیگر مقامات سے نو مسلم بچے آتے رہے، اور علم دین سے سیراب ہوتے رہے۔ (ان کے لئے قیام و طعام کا نظم بھی کیا گیا) الحمدللہ بعد میں ان نو مسلم

بچوں میں حافظ قرآن بھی ہوے ۔ **ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء** ۔ اب بھی یہ مدرسہ مولا علی میں قائم ہے، اور نو مسلم بچے، اس ادارہ سے مستفید ہو رہے ہیں ۔

۱۹۷۸ء میں ہمارا تبلیغی وفد کھم پہنچا، اور وہاں بڑے عزم و ہمت کے ساتھ "غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ" کی گئی ۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک بڑے مجمع میں یہ دعوت بڑی پر اثر تھی، بعض نوجوان بے خود ہو کر "ایک خدا ایک خدا" کی صدا بلند کرنے لگے، اور بعض اشرار نے مقامی پولیس کو اطلاع کر دی، اور ہماری گرفتاری عمل میں آئی اور چند ہی گھنٹے بعد رہائی بھی عمل میں آ گئی ۔

دعوت اسلام کا یہ سلسلہ ۱۹۷۹ء تک جاری رہا، اسی سال ہمارے بعض ساتھی مشرق وسطیٰ چلے گئے، اور دوسرے سال ۱۹۸۰ء میں، میں امریکہ چلا آیا ۔ غرض دعوت کا یہ کام، غیر مسلموں والا ختم ہوا ۔ اللہ ہماری اس کوتاہی کو معاف فرمائے ۔

امریکہ پہنچ کر یہاں غیر مسلموں میں اس کام کو محدود انداز میں پھر شروع کیا گیا، اور زیادہ تر امریکہ کی جیلوں میں اس کام کو بڑی کامیابی حاصل ہوی، یہاں اس کام کے کرنے میں وہ مسائل نہیں کہ حکومت کی طرف سے کوئی رکاوٹ ہو ۔ یہاں اس کام کے لئے افراد نہیں ملتے، جو بھی باہر سے آتے ہیں، یہاں کے ماحول میں اکثر کھو جاتے ہیں ۔ اور صبح و مساء (DOLLAR) کا ایک چکر ہے جو "**ألھاکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر**" کی جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتا ہے ۔

دوسرے مسائل یہاں کے نو مسلموں کے ساتھ یہ ہیں کہ اکثر "کالے امریکی" اسلام کے دائرہ میں آتے ہیں، گو یہاں "SLAVERY" ختم ہو چکی ہے، لیکن عملی طور پر پوری طرح غلامی ختم نہیں ہوی ہے ۔ اور جو ظاہری طور پر غلامی سے آزاد ہیں، وہ بھی ذہنی طور پر اب بھی غلام ہیں ۔ غرض ان نو مسلموں کی "تعلیم و تربیت" اور ان کے "قیام و طعام" کا نظم ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، اور ایک ذہنیت نو مسلموں میں یہ پیدا ہو گئی ہے کہ جو (وراثتی مسلمان) ہیں ان کا یہ فریضہ ہے کہ ان کی اور ان کے

خاندان کی ہر طرح دیکھ بھال کریں اور طعام کے ساتھ ان کے قیام کا نظم بھی ہو، ہاں یہ ضرور ہے کہ حتی المقدور ان کے بعض مطالبات کو "مؤلفۃ قلوب" کے اسلامی حکم کو سامنے رکھ کر پورا کیا جائے، لیکن یہاں کے مسلمانوں کا قطعاً یہ مزاج نہیں، خالص دینی کام پر اکثر مسلمان خرچ کرنا نہیں چاہتے۔ شہرت و نمود پر اکثر خرچ کیا جارہا ہے، اور جو ٹھوس دینی کام کر رہے ہیں، ان کی تائید و نصرت سے یہاں کے اکثر مسلمان دور ہیں، اور ان پر وہ (CONSERVATIVE) مسلمان کا لیبل چسپاں کرتے ہیں۔ اور کام میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ غرض "غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت" ہم سب پر فرض ہے، یہ کام ہر وقت، ہر ساعت ہونا چاہئے اور ہر حالت میں اس کام کو انجام دیا جانا چاہئے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہماری کوتاہیوں کو معاف فرمائے۔ اے اللہ اس کام کو آسان فرما اور غیب سے سارے عالم میں اس کا سامان فرما۔ آمین.

OOOOOOO

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب (۳۸)

تبلیغ اسلام اور ہماری ذمہ داری

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

أما بعد ! قال اللہ تعالیٰ فی القرآن المجید :

"کنتم خیر أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر وتؤمنون باللہ"

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے نکالے گئے ہو، جو نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

"بلغوا عنی ولو آیة"

محترم حضرات !

اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سب سے اہم نعمت بندوں کی ہدایت ہے جو انبیاء کے ذریعہ دی جاتی رہی ہے، تبلیغ ہمارا دینی و ملی فریضہ ہے، جس کی ذمہ داری خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر امتی پر عائد کی گئی ہے، تبلیغ کا یہ کام صدیوں سے جمود کا شکار ہے، جس کی وجہ سے یہ پیغام ان لوگوں تک نہیں پہنچ رہا ہے جن کے ذہنوں پر گمراہی کے پردے پڑے ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں آخرت میں جب ہم سے سوال ہوگا کہ تم نے میرے دین کی اشاعت میں کتنا حصہ ادا کیا تو اس وقت ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوگا۔

کتاب و سنت کی روشنی میں ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ آدم کی وہ اولاد جو توحید کی نعمت سے محروم ہے ان تک دین پہنچانے کے کام کو آگے بڑھایا جائے ہمارے اس پیام کی بنیاد انسانی مساوات، انصاف، بھائی چارگی، نیکی اور خداترسی پر مشتمل اسلامی تعلیمات پر ہوگی۔

اس اہم کام کو منظم اور وسیع پیمانے پر انجام دینے کے لئے تبلیغ اسلام کے اس موضوع پر مختلف اصحاب علم کے خیالات سے واقفیت کے لئے ایک سمپوزیم بہ عنوان "تبلیغ اسلام کی ضرورت اور اہمیت" ۱۲/ مئی ۱۹۷۴ء قائد محترم عالی جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔

اس محفل میں سبھی مقررین اس بات پر متفق تھے کہ تبلیغ اسلام مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے، مسلمانوں کے موجودہ جمود کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ اشاعت دین کی اس شرط اولیں کو بھول گئے ہیں۔ اکثر مقررین نے کہا کہ یہ پیغام زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے اور حالات کے تقاضوں کا پابند نہیں، اس لئے تبلیغ کے لئے حالات کے سازگار ہونے کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ کسی بھی پیغمبر کے زمانہ میں حالات موافق نہیں رہے۔

اس سمپوزیم میں ظاہر کردہ خیالات کو عملی شکل دینے کے لئے صدر محترم سید خلیل اللہ حسینی نے ایک کمیٹی تشکیل دی، جس کا کنوینر اس ناچیز حافظ قاری محمد غوث ندوی کو مقرر کیا گیا، اس کمیٹی کے پہلے اجلاس میں تبلیغ اسلام کے متعلق بہت اہم تجاویز پیش ہوئیں جن پر غور کیا گیا، بالآخر متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ تبلیغ اسلام کے کام کو پائیدار بنیادوں پر منظم انداز سے چلانے کے لئے ضروری ہیکہ ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جہاں مبلغین کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو، اور کوشش کی جائے کہ فارغ التحصیل موزوں اصحاب کو ہمہ وقتی مبلغ بنایا جائے۔

اس فیصلے کے بعد دو ذیلی کمیٹیاں بنائی گئیں جس میں نصاب کمیٹی کی

ذمہ داری یہ تھی کہ مجوزہ دارالمبلغین کا نصاب تیار کرے، اور دوسری کمیٹی دیگر انتظامی امور پر غور کرنے کے لئے بنائی گئی تھی، نصاب کمیٹی اور دیگر امور کی کمیٹی کے لئے کئی نشستیں منعقد ہوئیں اور ان کی کاوشیں ایجنڈہ کے روپ میں اب آپ کے سامنے پیش ہیں۔

مختلف اوقات میں جن اصحاب نے ان میٹنگس میں شرکت کی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

(۱) قائد محترم عالی جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب (صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت

(۲) جناب سلیمان سکندر صاحب (نائب صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت)

(۳) جناب محمد یونس صاحب (سابق امیر جماعت اسلامی آندھراپردیش)

(۴) جناب حکیم اسعد الدین صاحب (سابق صدر جمعیت العلماء آندھراپردیش)

(۵) جناب مولانا محمدی صاحب (جماعت اہل حدیث)

(۶) جناب زین العابدین صاحب (سابق نائب ناظم محکمہ۔ زراعت)

(۷) جناب ظہیر الدین صاحب انجنیر

(۸) جناب عبد الفتاح صاحب

(۹) جناب محمد انور صاحب (ریڈر جامعہ عثمانیہ)

(۱۰) جناب علی الدین افضل صاحب (لکچرار کالج آف لنگویجس)

(۱۱) جناب محمد عبد الجبار فاروقی صاحب (لکچرار انوار العلوم کالج و سابق ریڈر جامعہ عثمانیہ)

(۱۲) جناب سید خواجہ معین الدین صاحب قادری (لکچرار انوار العلوم کالج و سابق ریڈر جامعہ عثمانیہ)

(۱۳) جناب نظام الدین مغربی صاحب (لکچرار اردو آرٹس کالج)

(۱۴) جناب خواجہ حمید احمد صاحب (سابق اسسٹنٹ سکریٹری حکومت آندھراپردیش)

(۱۵) جناب غلام صمدانی صاحب

(۱۶) حافظ قاری محمد غوث ندوی (کنوینر تبلیغ اسلام کمیٹی و صدر شعبۂ عربی انوار العلوم کالج)

تبلیغ اسلام کا یہ منصوبہ قائد محترم عالی جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب کی (۴۰) سالہ غور و فکر کا نتیجہ ہے جو اب عملی شکل اختیار کر رہا ہے۔

یوں تو تبلیغ اسلام کا کام بڑا وسیع اور ہمہ گیر نوعیت کا ہے ، انگریزی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں ایسا لٹریچر تیار کرنے کی ضرورت ہے کہ لوگ سمجھ سکیں کہ اسلام کیا ہے اس کے علاوہ مسلم قوم کے باشعور طبقے کو اس کام پر مائل کرنے کے لئے سینکڑوں مقررین اور واعظین کی ضرورت ہوگی۔

پھر غیر مسلموں میں تبلیغ کرنے کے لئے ان کی زبان و روایات اور رسم و رواج سے واقفیت بھی ضروری ہوگی۔اور ایسے مقررین و مبلغین کی تعداد سینکڑوں میں ہونی پڑے گی جو ہمہ وقتی طور پر تبلیغ کے کام کے لئے وقف ہوں اور ان کو فکر معاش سے بے نیاز کر دیا گیا ہو۔اس وسیع اور ہمہ گیر کام کو منظم اور پائیدار بنیادوں پر چلانے کے لئے ایک ایسے مرکز کی ضرورت ہے جہاں سے مسلسل مبلغین تیار ہو کر نکلتے رہیں۔چنانچہ دارالمبلغین اس ضرورت کی تکمیل ہے ! الحمدللہ کل ہند مجلس تعمیر ملت نے مبلغین کی صحیح تعلیم و تربیت اور ان کی کردار سازی کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوے دارالمبلغین کے قیام کا بیڑا اٹھایا ہے ۔ اور مجلس انتظامی جو اس دارالمبلغین کے لئے تشکیل دی گئی ہے اس میں مختلف مکاتب فکر کے اصحاب کو زحمت شرکت دی گئی ہے تاکہ لوگ جماعتی مسائل سے بلند ہو کر (تعاونوا علی البر والتقویٰ) کے ارشاد الہیٰ کے پیش نظر اس نیک و مقدس کام میں تعاون

کریں۔

اس طرح تشکیل دی گئی مجلس انتظامی کا آج پہلا اجلاس ہو رہا ہے۔ کل (۴۷) اصحاب کو مجلس انتظامی میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس میں سے چند ایک نے اپنی مصروفیت کی بناء پر رکنیت کی قبولیت سے معذرت ظاہر کی ہے، اور چند اصحاب حیدرآباد سے باہر ہیں اس لئے ان کا عندیہ معلوم نہ ہو سکا۔ آپ اصحاب کا میں دل کی گہرائیوں سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ اور اپیل کرتا ہوں کہ خدمت اسلام کے اس مقدس کام میں دل کھول کر تعاون فرمائیں۔

مجلس انتظامی کا دستور جو ابھی پیش ہوگا اس کی رو سے مجلس انتظامی دارالمبلغین کے علمی، انتظامی اور مالی امور سے متعلق پوری ذمہ دار ہوگی۔ اس کے نصاب پر نظرثانی اور مالی استحکام کے لئے مستقل کمیٹیاں کام کریں گی جن کی تشکیل مجلس انتظامی کرے گی۔

نصاب :

دارالمبلغین کے نصاب میں تلاوت قرآن مجید، تجوید، تفسیر قرآن کریم، حدیث شریف، سیرت طیبہ، تعلیمات اسلامی، فقہ اسلامی، تاریخ اسلام، عربی ادب، مسلم مفکرین کے سوانح و افکار، اسلام اور افکار جدیدہ کا تقابلی مطالعہ شامل ہیں، اس کے علاوہ مبلغین کی اردو انگریزی اور علاقائی زبان میں تقریری صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے گا تاکہ وہ دیہی علاقوں میں بھی وہاں کی زبان میں تبلیغ کر سکیں۔

فی الوقت یہ جماعتیں ۶ تا ۹ ساعت شام مدینہ منشن نارائن گوڑا میں ہوا کریں گی۔ منصوبہ ہے کہ اس دارالمبلغین کو اقامتی درسگاہ میں بدل دیا جائے (۱)۔

---

(۱) الحمدللہ بعد میں ۱۹۸۰ء میں دارالمبلغین (اقامتی درسگاہ) بمقام مولا علی میں قائم کیا گیا۔

تدریس کے لئے علماء کی ہمہ وقتی و جزو قتی خدمات حاصل کی گئی ہیں ۔ فی الحال حسب ذیل اساتذہ نے اپنا وقت دینے کے لئے آمادگی ظاہر کی ہے :

(۱) حافظ قاری محمد غوث ندوی (عمید الکلیۃ) (اعزازی ہمہ وقتی)
(۲) مولانا محمد صادق الانصاری (جزو قتی لکچرار)
(۳) مولانا سلطان محی الدین (جزو قتی لکچرار)
(۴) جناب ظہیر الدین احمد (جزو قتی لکچرار)
(۵) جناب حامد غوری (جزو قتی لکچرار)
(۶) جناب محمد انور (جزو قتی لکچرار)
(۷) جناب محمد عمران اعظمی عمری (ہمہ وقتی لکچرار)

ان کے علاوہ وزیٹنگ پروفیسرس کی حیثیت سے بھی حسب ذیل اصحاب کی خدمت سے استفادہ کیا جائے گا :

(۱) قائد محترم عالی جناب سید خلیل اللہ حسینی
(۲) مولانا سید عبد الوہاب بخاری
(۳) مولانا حمید الدین عاقل
(۴) مولانا الطاف حسین فاروقی
(۵) مولانا حامد صدیقی
(۶) جناب غلام محمد صوفی

توقع ہے کہ بیرون حیدرآباد کے علماء کو بھی اس میں شامل کیا جاسکے گا۔
آج کے ایجنڈہ میں دار المبلغین کے اخراجات کے ایک سال کا تخمینہ پیش کیا

جارہا ہے۔آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ بڑی کھینچ تان کے بعد بنائے ہوے اس تخمینہ کے مطابق پہلے سال سترہ ہزار (۱۷۰۰۰) روپیہ کا خرچ ہوگا۔اور اگر ابتدائی اخراجات جو اب تک ہوچکے ہیں ان کو شامل کرلیا جائے تو یہ خرچ اٹھارہ ہزار روپیہ سے متجاوز ہوجائے گا۔میں نہیں سمجھتا کہ اتنے عظیم کام کے لئے آپ اصحاب کی دلچسپیوں سے اٹھارہ ہزار روپیوں کا انتظام نہیں ہوسکتا۔

اگر آپ خود رقمی تعاون کریں اور اپنے حلقہ اثر سے ماہانہ / سالانہ عطایا کے وعدے دلائیں اور ہر شخص اسی طرح ایک ہزار روپیہ دلانے کی ذمہ داری قبول کرے تو یہ کام بڑی آسانی سے ہوسکتا ہے۔

کل ہند مجلس تعمیر ملت کا ہر کام بے سروسامانی میں محض اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر شروع ہوتا ہے۔اور یہی ایقان نصرت الہیٰ کا موجب ہوتا ہے۔ہمیں یقین ہے کہ بہت سے مسلمان خدا کی رضا کے لئے اس کام میں آگے بڑھیں گے۔

تبلیغ اسلام کا یہ مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا اور اس سلسلہ میں ہماری کوششیں بارآور نہیں ہوسکتیں جب تک کہ مبلغین کی صحیح تعلیم و تربیت اور کردار سازی کے لئے ایک مرکزی ادارہ قائم نہ کیا جائے۔چنانچہ کل ہند مجلس تعمیر ملت نے انھیں چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہوے دارالمبلغین کے قیام کا بیڑا اٹھایا ہے، اور اس سلسلہ میں آپ حضرات کو آج زحمت دی گئی ہے۔اور آپ حضرات پر اس ادارہ کے مجلس انتظامی کے اراکین کی حیثیت سے اس کے انتظام کی دیکھ بھال کرنے اور اس کو پروان چڑھانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

دارالمبلغین کے قیام کے سلسلہ میں اب تک ابتدائی اخراجات کے طور پر ایک ہزار روپیہ کا صرفہ عائد ہوا ہے اور ایک سال کے لئے تخمیناً سترہ ہزار روپیہ کا خرچ ہے۔

اکابرین ملت !

یہ آپ کی اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم کام کے لئے ہمیں توفیق عطا فرمائی۔ اس عالم گیر پیغام کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا جس کا مقصد بھی عظیم ہے اور ثواب بھی عظیم۔ راستہ بڑا پر خطر ہے لیکن اس کا مقصد رضائے الہیٰ ہے۔ سرزمین ہند کی سنگلاخ چٹانوں میں سے ہمیں اپنی راہ الگ نکالنی ہے یہ وہ راہ ہے جسے قرآن حکیم نے صراط مستقیم کہا ہے اور اس قسم کی کوشش کرنے والوں کو خیر امت کے لقب سے نوازا گیا ہے، اس صنم کدہ ہند کی مٹی بڑی زرخیز ہے، اگر اس کو توحید و رسالت کے زم زم سے نم کیا جائے تو یہاں کے ہر ذرہ سے لا الہ الا اللہ کے سوتے پھوٹ پڑیں گے۔ وقت آپ کا انتظار کر رہا ہے اور توحید کے پیاسے ابنائے وطن ہمارے منتظر ہیں۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ ہم نے گھنٹوں نہیں صدیوں کا وقت کھویا ہے۔ اب مزید انتظار کی تاب نہیں اگر اس کام کو لے کر ہم نہیں اٹھیں گے تو اللہ تعالیٰ کسی اور قوم سے اپنے دین کی حفاظت کا کام لے لے گا۔ اور ہم اس سعادت سے محروم ہو جائیں گے۔

آئیے آج کی اس محفل سے یہ عزم صمیم لے کر اٹھیں کہ ہم کو حق کا نقیب بننا ہے۔ اس کے پیغام کو گھر گھر پہنچانا ہے۔ اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم مبلغین کی ایک تربیت یافتہ جماعت تیار کریں۔

اللہ نے چاہا تو اس دار المبلغین کا افتتاح بدست عالی جناب قائد محترم سید خلیل اللہ حسینی صاحب یکم / شعبان ۱۳۹۴ھ مطابق ۲ / اگست ۱۹۷۴ء کو ۵ ساعت شام ہوگا۔

حافظ قاری محمد غوث ندوی

صدر شعبہ عربی انوار العلوم کالج
کنوینر تبلیغ اسلام کمیٹی
عمید (پرنسپل) دار المبلغین

(رپورٹ)

باب (۳۹)

روداد تبلیغی سفر

(زندگی کا سب سے خوشگوار پہلو)

مقام : نلگنڈہ۔ تاریخ ۱۲/اپریل ۱۹۷۵ء

افراد وفد : جناب عبدالرزاق صاحب، جناب عبدالعزیز صاحب، قاری محمد غوث ندوی (احقر)

الحمدللہ دارالمبلغین واقع مدینہ منشن، نارائن گوڑا حیدرآباد کی مسجد میں دو رکعت نفل نماز پڑھ کر دعا کر کے یہ وفد ٹھیک ۸ بجے صبح سفر پر روانہ ہوا، ناچیز قاری محمد غوث ندوی کی امارت میں بس اسٹانڈ سے ہماری بس کوئی ساڑھے نو بجے روانہ ہوی اور ساڑھے بارہ بجے ہم نلگنڈہ پہنچے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمیں نلگنڈہ کی مسجد تعلقداری میں قیام کرنا تھا، بس اسٹانڈ سے ہم لوگ سیدھے مذکورہ مسجد کی طرف جارہے تھے کہ راستے میں وہاں کی تین سربرآوردہ شخصیتوں جناب مرزا محمود صاحب تاجر و کنٹراکٹر، جناب محمد عبداللہ صاحب تاجر، اور جناب عبدالرحیم صاحب تاجر سے ملاقات ہوی، مختصر طور پر ہم نے ان سے اپنے سفر کی غرض و غایت بیان کی تو ان افراد نے ہماری کوششوں کو سراہا اور اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ ہم جس دم مسجد تعلقداری پہنچے تو نماز ظہر کا وقت قریب تھا۔ اس لئے ہم لوگوں نے طے کیا کہ نماز کے بعد مسلمانوں کو مخاطب کیا جائے۔ چنانچہ نماز کے بعد میں نے دارالمبلغین کے قیام کے مقاصد سے واقف کرواتے ہوے اپنے سفر کی غرض و غایت سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ اور اعلان کیا کہ بعد نماز مغرب اسی مسجد میں ایک

اجتماع عام منعقد ہوگا جس میں آپ حضرات سے شرکت کی خواہش کی جاتی ہے۔

اس کے بعد دوپہر کا کھانا کھایا گیا اور تھوڑا سا آرام کر کے یہ طے کیا گیا کہ عصر کی نماز ہر شخص الگ الگ مسجد میں پڑھے اور وہاں مغرب کے بعد کے اجتماع کا اعلان کر کے مسلمانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ بعد نماز مغرب حسب پروگرام مسجد تعلقداری میں ایک اجتماع عام کا انعقاد عمل میں آیا جس میں تقریباً تین سو مسلمان شریک تھے۔ اجتماع کو ناچیز قاری محمد غوث ندوی نے مخاطب کیا اور پوری تفصیل سے تبلیغ اسلام کی اہمیت واضح کرتے ہوئے دار المبلغین کے قیام اور اپنے تبلیغی سفر کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ بعد نماز عشاء ایک صاحب کی نشاندہی پر ہم لوگ ایک غیر مسلم ڈاکٹر سے ملنے گئے مگر اس وقت ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

رات کے کھانے کے بعد دوسرے دن کے تبلیغی پروگرام کو قطعیت دی گئی اور تعمیر ملت کی شاخ کے قیام کے سلسلہ میں غور کیا گیا۔ مقامی حضرات سے تبادلہ خیال کے بعد طے کیا گیا کہ سنجیدہ طلباء اور نوجوانوں کو اس کے لئے تیار کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ بعد میں نلگنڈہ کی مسلم لیگ کے صدر صاحب سے ربط پیدا کر کے ان سے اس سلسلہ میں تعاون کی خواہش کی گئی۔ لیکن موصوف نے اس سے عدم دلچسپی کا اظہار کیا تو بات کچھ آگے نہ بڑھ سکی۔

پروگرام کے مطابق دوسرے دن بعد نماز فجر ناچیز قاری محمد غوث ندوی کا درس قرآن مجید اور تبلیغ کی اہمیت پر تقریر ہوی۔ نماز اشراق کے بعد ہم غیر مسلموں سے انفرادی ملاقاتیں کرنے روانہ ہوئے۔ ارکان وفد کے ساتھ مقامی مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد کا تعاون بھی حاصل رہا۔

راستہ میں جو غیر مسلم افراد ملتے رہے ان کے علاوہ کوئی بیس مکانات پر دستک دے کر لوگوں سے ملاقات کی اور ان کے سامنے بغیر کسی جھجک اور حجاب کے

دین حق کی دعوت پیش کی۔ یہ سلسلہ (۷) بجے سے (۹) بجے تک جاری رہا۔

ناشتہ کے بعد نلگنڈہ کے دو اہم بازاروں میں غیر مسلموں کے اجتماعات منعقد کرنا طے کیا گیا تھا۔ چنانچہ پہلا اجتماع وہاں کے مصروف ترین بڑے بازار میں منعقد کیا گیا جس میں محتاط اندازہ کے مطابق کوئی چار سو غیر مسلم افراد نے ہماری دعوت کو غور سے سنا اور ہر شخص نے اچھے تاثر و خیالات کا اظہار کیا۔

دوسرا اجتماع نلگنڈہ کے بس اسٹانڈ پر منعقد کیا گیا۔ یہاں بھی کم و بیش شرکاء کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ دونوں مقامات پر ناچیز نے عربی اور اردو میں۔ اور جناب عبدالعزیز وکیل صاحب نے انگلش میں اور جناب عبدالرزاق صاحب نے تلگو میں مخاطب کیا۔ یہ سلسلہ ساڑھے بارہ بجے تک چلتا رہا۔ اس سے فارغ ہو کر ہم مسجد تعلقداری آئے، نماز ظہر ادا کی اور دوپہر کے کھانے کے بعد ڈاکٹر زائلو ریڈی سے ملنے کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ بفضل خدا ان سے ملاقات ہوی۔ ڈاکٹر صاحب ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ دوران گفتگو پتہ چلا کہ موصوف کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ وہ نہ صرف قرآن کا بلکہ کئی دوسری اسلامی کتب کا بھی بہ نظر غائر مطالعہ کر چکے ہیں، ہم نے بھی اپنی دعوت ان کے سامنے پیش کی اور پوری جرأت سے ان سے خواہش کی کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ چنانچہ ہماری درخواست کو انھوں نے بطیب خاطر منظور فرمالیا اور وعدہ کیا کہ عشاء کی نماز میں مسجد اول تعلقداری آکر باضابطہ مسلمان ہونے کا اعلان کر دیں گے اور **الحمدللہ ثم الحمدللہ** کہ موصوف حسب ہدایت نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر مسجد تشریف لائے اور خاکسار قاری غوث ندوی کے ہاتھ پر ایک مجمع کثیر کے روبرو کلمہ طیبہ پڑھ کر مذہب اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔

"واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم"

اسی دن بعد نماز مغرب خاکسار نے اپنے ایک عزیز کے گھر میں (خاکسار کا وطن

مالوف بھی نلگنڈہ ہی ہے) عورتوں اور نوجوانوں کے ایک بڑے اجتماع کو مخاطب کیا جس میں اصلاح معاشرہ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے تبلیغ کی اہمیت و عظمت اور اس کے تعلق سے مسلمانوں کی ذمہ داری پر مفصل روشنی ڈالی۔ شرکاء اجتماع نے جن میں زیادہ تر مقرر کے اعزاء و اقرباء ہی تھے، غیر مسلموں میں تبلیغ کے کام کی اہمیت کا اعتراف کیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ سے اس سلسلہ میں وہ برابر جدوجہد کرتے رہیں گے ان شاءاللہ العزیز۔

واضح رہے کہ نو مسلم ڈاکٹر صاحب نے جن کا اسلامی نام انھیں کے انتخاب کی بناء پر "محمد عمر" رکھا گیا، انھوں نے تقریب گلپوشی وغیرہ کے بعد ارکان وفد سے کئی قسم کے سوالات کئے جو زیادہ تر اسلام کے بارے میں ان کے شکوک و شبہات پر مبنی تھے۔ نیز ڈاکٹر صاحب نے دیگر مشہور مذاہب کے بارے میں اپنی معلومات سے ہمیں واقف کرایا اور یہ نشست ساڑھے بارہ بجے رات تک جاری رہی۔ ایک بجے کے بعد ایک عزیز کے گھر ارکان وفد نے رات کا کھانا کھایا اور مسجد تعلقداری آکر سو رہے۔

تیسرے دن صبح نماز فجر کے بعد خاکسار نے مسلمانوں کو مخاطب کیا۔ نو مسلم ڈاکٹر صاحب کی تالیف قلب اور دینی معلومات میں اضافہ کے لئے ذمہ دار مسلمانوں کو متوجہ رہنے کے لئے پابند کیا۔ بعد نماز اشراق یہ تبلیغی وفد واپسی کے لئے نلگنڈہ بس اسٹانڈ آیا۔ اور تقریباً (۸) بجے وہاں سے روانہ ہو کر ۱۱ بجے صبح بخیر و عافیت دارالمبلغین پہنچا۔ الحمدللہ اولاً و آخراً۔

قاری محمد غوث ندوی

امیر وفد تبلیغ

۱۴/۴/۱۹۷۵ء

باب (۴۰)

اپنی اولاد، ذریت، شاگرد اور دوست احباب کو چند مخلصانہ ہدایتیں

میرے عزیزو اور دوستو ! اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ یہ دعا مانگتے رہنا : ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار ، دین کو ہمیشہ دنیا پر ترجیح دو، کیونکہ اُس کو بقا ہے اور اِس کو فنا ہے۔

غافل نے اِدھر دیکھا عاقل نے اُدھر دیکھا

بادشاہ یا صاحب جاہ و منصب کے پاس بہت کم آمد و رفت رکھنا، ان سے ہر وقت اس طرح پر خطر رہنا جیسے انسان آگ سے احتیاط رکھتا ہے، جب تک کوئی خاص ضرورت نہ ہو ان کے پاس نہ جانا کہ اپنا اعزاز و وقار قائم رہے۔

اگر کوئی شخص شریعت میں کسی بدعت کا موجد ہو تو علانیہ اس کی غلطی کا اظہار کرنا، تاکہ لوگوں کو اس کی تقلید کی جرأت نہ ہو، اس بات کی پرواہ نہ کرنا کہ وہ شخص جاہ و حکومت رکھتا ہے یا صاحب ثروت ہے، کیونکہ اظہار حق میں خدا تمہارا مددگار ہوگا اور وہ اپنے دین کا آپ محافظ و حامی ہے۔

زندگی کے عام کاروبار میں ان باتوں کا خیال رکھو

یاد رکھو ! تحصیل علم کو سب پر مقدم رکھنا، اس سے فراغت ہونے پر جائز ذریعوں سے دولت حاصل کرنا، کیونکہ ایک وقت میں علم و دولت دونوں کی تحصیل نہیں ہو سکتی ۔ پھر شادی کرنا لیکن اس وقت جب یقین ہو کہ اہل و عیال کی تمام ذمہ داریاں اٹھا سکو گے ۔ ایسی عورت سے شادی نہ کرنا جو دوسرے شوہر سے اولاد

رکھتی ہو، عام آدمیوں اور خصوصاً دولت مندوں سے کم میل جول رکھنا ورنہ ان کو گمان ہوگا کہ تم ان سے کچھ توقع رکھتے ہو، بازار میں جانا تو کم جانا اور ضرورت ہی پر جانا، دوکان اگر تمہاری نہ ہو تو اس پر ہرگز نہ بیٹھنا، راستہ میں اور مسجد میں (بغیر مسافرت یا ضرورت کے) کوئی چیز کھالینا، سقایات یا سقاؤں کے ہاتھ سے پانی پی لینا، ان تمام باتوں سے نہایت احتراز رہے۔ اگر تم عالم دین ہو اور کوئی شخص تم سے مسئلہ پوچھے تو صرف سوال کا جواب دو۔ اپنی طرف سے کچھ نہ بڑھاؤ۔ عقائد کے متعلق عوام سے گفتگو نہیں کرنی چاہئے، شاگردوں کے ساتھ ایسے خلوص اور محبت سے پیش آؤ کہ کوئی غیر دیکھے تو سمجھے کہ وہ تمہاری اولاد ہیں۔ عام اور معمولی رتبہ کے لوگ مناظرہ کرنا چاہیں یا بددین اور غبی لوگ مسائل میں الجھائیں تو احتراز کرو۔ کسی شہر میں جانا ہو تو وہاں کے علماء و فضلاء سے اس طرح ملو کہ ان کو رقابت کا خیال نہ ہو، علمی تذکرہ آئے تو جو بات کہو خوب سوچ سمجھ کر کہو۔ اور وہی کہو جس کا کافی ثبوت دے سکتے ہو۔ اگر تمہیں کوئی بات معلوم نہیں تو صاف کہدو کہ میں اس مسئلہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، اس طرح کہنے میں علم و امانت کی شان ہے اور اسی لئے "لا أدری نصف العلم" کہا گیا ہے، بحث و مباحثہ میں غصہ نہ کرنا چاہئے۔ اگر غصہ پر قابو نہ رہے تو خاموشی اختیار کرو، اور وہاں سے ہٹ جاؤ، ہنسنا کم چاہئے، زیادہ ہنسی سے دل مردہ ہوجاتا ہے، جو کام کرو اطمینان و وقار کے ساتھ کرو۔ کوئی شخص جب تک سامنے سے نہ پکارے کوئی جواب نہ دو، کیونکہ پیچھے سے پکارنا جانوروں کے لئے مخصوص ہے، راستہ چلو تو دائیں بائیں نہ دیکھو، گفتگو میں سختی نہ ہو، اور آواز بلند نہ ہونے پائے، کوئی چیز خریدنی ہو تو بیحد ضرورت ہی پر بازار جاؤ، اگر اللہ نے نوکر چاکر عطا کئے ہیں تو ان کو بھیج کر اشیاء منگوالو، خانگی تجارت دیانتدار نوکروں پر چھوڑ دینا چاہئے تاکہ تم کو اپنے مشاغل کے لئے کافی وقت اور فرصت ہاتھ آئے۔

اہل ثروت کے قریب سکونت اختیار نہ کرو، ان کی ہر بات سے بے پروائی اور

بے نیازی ظاہر کرو اور فقر کی حالت میں بھی وہی استغنا قائم رہے، عام آدمیوں میں بیٹھ کر وعظ نہ کہو، کیونکہ ایسے موقع پر واعظ اکثر جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتا ہے۔ شاگردوں میں کسی کو درس کی اجازت دو تو اس کی خوب جانچ پڑتال کر لو، پھر اجازت دو، ہر بات میں تقوی، پرہیزگاری اور امانت کو پیش نظر رکھو۔ خدا کے ساتھ دل سے وہی معاملہ رکھو جو لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہو۔ جس وقت اذان کی آواز آئے فوراً نماز کے لئے تیار ہو جاؤ۔ فرائض کی پابندی اختیار کرو، ہر مہینے میں دو چار دن روزے کے لئے مقرر کر لو۔ نماز کے بعد ہر روز کسی قدر وظیفہ پڑھا کرو، قرآن پاک کی تلاوت ناغہ نہ ہونے پائے، دنیا پر زیادہ مائل نہ ہو، اکثر قبرستان میں نکل جایا کرو۔ لہو و لعب سے پرہیز رکھو، گناہ کبیرہ و صغیرہ سے اجتناب رکھو، مسلمان اور ہمسایہ کی برائی دیکھو تو پردہ پوشی کرو۔ اہل بدعت سے بچتے رہو، نماز میں جب تک تم کو لوگ خود امام نہ بنائیں، امام نہ بنو، جو تم سے ملنے آئیں ان کے سامنے علمی تذکرہ کرو۔ اگر وہ اہل علم ہوں گے تو فائدہ اٹھائیں گے، ورنہ کم از کم ان کو تم سے محبت پیدا ہو گی۔

اہل جاہ و منصب اور اہل ثروت جب تم سے نصیحت طلب کریں تو کہنا کہ "دنیا کو طلب کرنے کی تین غرضیں ہو سکتی ہیں، عزت، ملک، مال، یہ سب تو آپ کو حاصل ہیں، اب تقویٰ اور عمل صالح بھی اختیار کیجئے، کہ دنیا و آخرت دونوں کی دولتیں حاصل ہوں۔ اور عام مسلمانوں کو تقویٰ و پرہیزگاری اور خوف خدا کی وصیت کرتے رہنا۔

حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے چند حکیمانہ مقولے

میرے عزیزو! اس موقع پر حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے چند حکیمانہ مقولے بھی سنتے چلیں: اور ان کو حرز جان بنالیں اور اپنی زندگی میں ان کو ڈھال لیں:

امام اعظم فرماتے ہیں: (۱) جس شخص کو علم نے بھی معاصی اور فواحش سے باز نہ رکھا، اس سے زیادہ زیاں کار کون ہو گا۔

(۲) "جو شخص علم دین میں گفتگو کرے، اور اس کو یہ خیال نہ ہو کہ ان باتوں کی بازپرس ہوگی، وہ مذہب اور خود اپنے نفس کی قدر نہیں جانتا"۔

(۳) "اگر علماء خدا کے دوست نہیں ہیں تو عالم میں خدا کا کوئی دوست نہیں۔

(۴) "جو شخص قبل از وقت ریاست کی تمنا کرتا ہے تو ذلیل ہوتا ہے"۔

(۵) "جو شخص علم کو دنیا کے لئے سیکھتا ہے، علم اس کے دل میں جگہ نہیں پکڑتا"۔

(۶) "سب سے بڑی عبادت ایمان اور سب سے بڑا گناہ کفر و شرک ہے، پس جو شخص افضل ترین عبادت کا پابند، اور بدترین معاصی سے محترز رہے، اس کی مغفرت کی بہرحال امید ہو سکتی ہے"۔

(۷) "جو شخص حدیث سیکھتا ہے، اور اس سے استنباط مسائل نہیں کرتا، وہ ایک عطار ہے، جس کے پاس دوائیں ہیں، لیکن یہ نہیں جانتا کہ کون سی دوا کس مرض کے لئے ہے"۔

(۸) "اور جو شخص علم کا مذاق نہیں رکھتا، اس کے آگے علمی گفتگو کرنا اس کو اذیت دینا ہے"۔

(۹) "اپنے دوست (نفس) کے لئے گناہ جمع کرنا، اور دشمن ورثاء کے لئے مال فراہم کرنا کیسی نادانی ہے"۔

یاد رکھو! "روٹی کا ایک ٹکڑا اور معمولی کپڑا امن و عافیت سے ملتا جائے تو اس عیش سے بہتر ہے، جس کے بعد ندامت اٹھانی پڑے"۔

یاد رکھو! مفت خوری کی عادت مت ڈالو، محنت و کاوش سے رزقِ حلال تلاش کرو، ورنہ تمہاری پرواز میں کوتاہی آئے گی۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عمدہ شعر وعظ و پند کا آپ بھی سن لیں جس کو وہ اکثر پڑھا کرتے تھے :

ومن المروۃ للفتی ما عاش دارا فاخرۃ
فاشکر اذا أوتیتھا و اعمل لدار الآخرۃ

"یعنی انسان جب تک زندہ ہے، عزت و آبرو کے لئے اس کو اچھا مکان چاہئے، ایسا مکان نصیب ہو تو شکر کرنا چاہئے، اور اخروی گھر کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔"

نوٹ : (ان ہدایات کو لکھنے میں زیادہ تر حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کو سامنے رکھا گیا ہے۔ جو سیرۃ النعمان از علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ سے ماخوذ ہیں)۔

عام نتائج و تجربات زندگی کا نچوڑ

کتاب، بلکہ کہنا چاہئے کہ کتاب زندگی کا مشکل ترین باب یہی ہے، ۵۷ سال کی زندگی کا خلاصہ تجربات میں کیا لکھا جائے اور کیا چھوڑا جائے ؟ جی میں تو بے اختیار یہی آرہا ہے کہ داستان زندگی (آہ کہ کتنی لذیذ، اور آہ کہ کتنی تلخ، دونوں ایک ہی وقت میں) کل کی کل بغیر ایک چھوڑے ہوئے دہرائی جائے۔ داستان زندگی کے دہرانے میں لگتا ایسا ہے کہ جیسے زندگی خود اپنے کو دہرا رہی ہے ! سوچنے بیٹھئے تو اپنی زندگی قابل صد نفرین و مستحق ملامت۔ اور نہ سوچئے تو جان عزیز سے بڑھ کر عزیز۔

سب سے پہلی بات تو یہ خیال رکھنے کی ہے کہ طبعی تقاضا و شوق اور چیز ہے اور ہوس اور چیز، بہ قول اکبر الہ آبادی

کہنے کی ایک حد ہے بکنے کی حد نہیں

جو فرق کہنے اور بکنے میں ہے وہی طبعی تقاضہ اور ہوس میں ہے۔

وہ راہبر کی ہدایت، یہ رہ گزر کا فریب

طبعی تقاضوں کی تکمیل کی جاسکتی ہے، لیکن ہوس کی آگ بجھانے کے لئے کوئی حد و نہایت نہیں، ہوس رانی جتنی بھی کیجئے گا، طبیعت بجائے آسودہ ہونے کے حریص سے حریص تر ہوتی جائے گی، آگ بجھنے کے بجائے بھڑکتی ہی جائے گی، ضرر و زیاں صریح واقع ہوتا جائے گا، لیکن طبیعت کو اس کا احساس ہی سرے سے جاتا رہے گا۔ نفس امارہ بڑا منطقی، بڑا فقیہ واقع ہوا ہے، ہر نفس پرستی، ہر ہوسناکی، اور اس سے پیدا ہونے والے ہر ضرر و زیاں کی کوئی نہ کوئی خوبصورت سی تاویل و توجیہ ہر بار کرے گا، اور "ھل من مزید" کے نعرے لگاتا آپ کو برابر مغالطہ میں مبتلا اور دھوکے میں الجھائے رکھے گا! لازم ہے کہ ہر خواہش نفس پر حاکم طبیعت کو نہیں، عقل کو رکھئے، اور عقل کی حاکمیت کا نفاذ بڑی سختی سے کرتے رہئے، ہیجان نفس کے وقت خواہ وہ ہیجان غصہ کا ہو، حبِ جاہ کا ہو، حرص مال کا ہو، یا شہوت جنسی کا ہو عقل تک اندھی اور مغلوب ہوجاتی ہے، ایسے موقع پر دست گیری شریعت سے پائیے، اور پناہ احکام خداوندی میں ڈھونڈئے، نفس کو بے لگام کسی حال میں بھی نہ ہونے دیجئے، اس شورہ پشت گھوڑے سے آپ ذرا غافل ہوے اور اس نے آپ کو زمین پر دے پٹکا! غصہ اور شہوانیت، یہ نفس کے دو بے پناہ حربے ہیں، اور انسانیت کے دشمن قاتل! اگر ان پر نو عمری ہی میں قابو پالیا گیا، اور انھیں عقل اور اس سے بڑھ کر شریعت کے دائرہ میں لے آیا گیا، جب تو خیر ہے، ورنہ اگر یہ سنپولئے بڑھ کر اژدھے ہوگئے تو کوئی صورت ان کے عذاب سے نجات پانے کی نہ رہے گی، سن کے ساتھ ساتھ ان کی گرفت بھی سخت سے سخت تر ہوتی جائے گی، انسان خمیازہ بھگتے گا، پچھتائے گا، جھنجھلائے گا، پھر بھی بس پھڑپھڑا کر رہ جائے گا، ان کے پنجہ سے رہائی کی کوئی صورت آسان نہ ہوگی۔

روپیے کی محبت بھی بڑی بری بلا ہے، سن کے ساتھ ساتھ یہ گھٹتی نہیں، بلکہ حرص و ہوس عموماً بڑھ ہی جاتی ہے، اور وجہ جواز میں ذہن نئی نئی ضرورتیں گھڑنا شروع کر دیتا ہے، ضرورت اس میں اپنے کو قناعت کا خوگر بنالینے کی ہے۔

یہ جس نے نہ کیا، اسے تختیاں قدم قدم پر پیش آتی رہیں گی، لیکن روپیے کی محبت اور شئے ہے اور اس کی قدر اور۔ روپیے کی محبت تو بے شک ہرگز نہ پیدا ہونے پائے، لیکن روپیہ کی قدر ضرور ہو، یہ نہ ہوا تو دوسرا مرض اسراف کا پیدا ہو کر رہے گا بقول حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ : "درہم جیب میں ضرور ہو، مگر دل میں نہ ہو، جیب میں ہو تو ضرورتیں پوری ہوتی رہیں گی، اور اگر دل میں ہو تو آخرت کا ضیاع ہے۔

دل کو ریا و نمائش سے خالی اور اخلاص سے لبریز رکھنا بھی کوئی آسان و معمولی چیز نہیں، بڑی ریاضت اور بڑے مجاہدوں کے بعد ہی یہ دولت ہاتھ آسکتی ہے۔ اور پھر بھی ہر وقت ڈگمگا جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ **وما یلقّاھا الا ذو حظ عظیم**، ایک بڑا دخل اس میں صدق دل سے دعا مانگنے کا ہے، اور اسباب و ذرائع شہرت سے اپنے کو دور رکھنے کا ہے، نفس عاشق ہے جاہ کا، اور انسان ایک حد تک خوشامد پسند طبعاً ہوتا ہے۔ راہ اخلاص کا سب سے بڑا راہزن، مداحوں، معتقدوں، مریدوں کا گروہ ہوتا ہے، ہر وقت کی داد و تحسین، رضاجوئی حق کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

جب میں ان چیزوں پر نظر ڈالتا ہوں، اور اپنی زندگی کے احوال کو ٹٹولتا ہوں تو میرا ضمیر کانپ سا اٹھتا ہے۔

والدین ماجدین کی خدمت تو خیر تھوڑی بہت بن پڑی، حق کیا ادا ہوتا، عبادتوں کا حال تو اور بھی ابتر۔ نمازوں میں بجز ٹکر لگانے کے اور کیا کیا، دیگر عبادات بھی بس ایسی ہی ہیں جیسے خانہ پری کہا جائے، سوچتا ہوں کہ اپنا حشر کیا ہونا ہے۔ **لا الہ الا أنت سبحانک انی کنت من الظالمین** سوا اس کے کہ وہ ارحم

الراحمین اپنی اُرحم الراحمینی کا کرشمہ دکھلادے، یا اپنے رحمت عالم پیغمبرؐ اور دوسرے شافعین کو شفاعت کا اشارہ کردے !

شادی ۲۵ ویں سال میں ہوی، بیوی سے انس و محبت کا اتار چڑھاؤ بڑے ہی پیچ و خم کے بعد آج تک الحمدللہ قائم ہے۔ محبت کا لفظ غلط استعمال ہوا" فریب آب و گل "کا نام محبت رکھنا، حقیقت و لغت دونوں پر ظلم کرنا ہے۔

اور اسی کھوکھلی محبت کا حاصل بقول اکبرؔ۔

کار جہاں کو دیکھ لیا میں نے غور سے
اک دل لگی ہے سعی میں حاصل میں کچھ نہیں

دل لذت اٹھانے پاتا بھی نہیں کہ خود لذت چھلاوہ بن کر نظر سے غائب ہوجاتی ہے۔

بڑے ہی تلخ تجربوں اور خوب ہی ٹھوکریں کھانے کے بعد پرزور وصیت سارے ناظرین سے ہے کہ " دنیا سے دل ہرگز نہ لگائیں اور اس کے مکر و فریب میں نہ آئیں، جس کے صدہا چہرے اور بے شمار نقابیں سہی لیکن انسان بہرحال جسم و جسد کے ساتھ ہی اس خاکدان میں بھیجا گیا ہے، اور اس حکمت کی بھی رعایت رکھنا لازمی ہے " دنیا کو برتئے مگر دل نہ لگائیے۔ دل تو بس آخرت ہی سے لگائے رکھئے۔ اکبرؔ ہی کے لفظوں میں۔

غافل نے اِدھر دیکھا عاقل نے اُدھر دیکھا

دیکھئے ابھی کتنی اور میعاد کاٹنا ہے، دل تو اسی مژدۂ جاں بخش کے سننے کو تڑپ رہا ہے کہ :

" ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی "

اپنے حق میں تو بس ایک ہی اور آخری دعا یہ ہے کہ بلاوا اس وقت آئے جب یہ ناکارہ اور آوارہ، دین کی خدمت میں مشغول ہو، قرآن و حدیث کا پڑھنا پڑھانا ہو، اسلام کی دعوت و تبلیغ میں مشغول ہو یا اپنے محبوب سرور عالمؐ کی کسی ادا کی معرفت کی دعوت دے رہا ہو !

پڑھنے والے، رخصت ! اس عالم ناسوت میں آخری سلام، ملاقات، بہ فراغت واطمینان ان شاءاللہ بس اب جنت ہی میں ہوگی !

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ !

○○○○○○○

باب (۴۱)

زندگی کا خلاصہ و عطر

والدین ماجدین اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہیں، حضرات اساتذہ روحانی باپ ہیں، بیوی خیر متاع الدنیا ہے، اولاد آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اچھے دوست سکون و راحت کا باعث ہیں، عزیز و اقرباء اجتماعی زندگی میں ترقی کا ذریعہ ہیں، اور یہ ساری نعمتیں اس وقت ہیں جب کہ ہم میں اخلاص عمل ہو، اور تقویٰ و طہارت والی زندگی ہم کو نصیب ہو، "ان اکرمکم عند اللہ أتقاکم"۔

عزیزو ! آج ساری دنیا میں جسمانی زندگی کے لئے راحت و سکون کا سامان ہو رہا ہے، اور جو چیز مفقود ہے وہ روحانی زندگی ہے، اور اس زندگی کے امام بس خال خال رہ گئے ہیں :

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل
وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

ان اللہ والوں کے لئے علامہ اقبال نے خوب فرمایا تھا :-

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دئے ہیں انداز خسروانہ

ہماری ظاہری زندگی کا انتشار دراصل اندرونی انتشار کا نتیجہ ہے :-

صفیں کج ، دل پریشاں ، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے جب تنبیہ ہوتی ہے اور مدد آیا چاہتی ہے ، تو تھوڑی دیر کی آندھی اور پانی کا چھینٹا وہ کام کر جاتا ہے جو دینی ادارے اور واعظین اور سحرانگیز مقررین کی منظم جماعتیں بھی نہیں کر پاتیں " **وما یعلم جنود ربک الا ھو** " حیدرآباد میں پولیس ایکشن مسلمانوں کے لئے ایک تنبیہ تھی ، جس کے بعد الحمدللہ مسلمانوں میں ایک عام دینی و تعلیمی بیداری پیدا ہوی ۔ حکومت ہند کی آزادی اور حکومت آصفیہ کے زوال کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے آثار بظاہر اس شعر کے مصداق تھے :

مدارس آیات خلت من تلاوۃ
و منزل " علم " مقفر العرصات

(یعنی جہاں آیات قرآنیہ کا دن رات درس ہوتا تھا، وہ مقامات تلاوت تک سے محروم

ہیں، اور جہاں علم کا شب و روز تذکرہ تھا وہاں خاک اڑ رہی ہے)۔

لیکن اللہ کے محبوب بندے، جن کو دولت اخلاص و یقین سے نوازا جاتا ہے وہ جب عزم و ہمت کے ساتھ اٹھتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ علم و عرفان کے چشمے بہاتے ہیں۔ اور یہ وہ مردانِ خدا ہیں کہ جن کے نزدیک لوگوں کی عقیدت و پسندیدگی اور مدح و تعریف پر کاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتی۔

فلیتک تحلو و الحیاۃ مریرۃ
ولیتک ترضی والأنام غضاب
ولیت الذی بینی و بینک عامر
وبینی وبین العالمین خراب

(شاعر ابو فراس حمدانی کہتا ہے: اے کاش آپ میرے لئے شیریں ہو جائیں پھر چاہے پوری زندگی تلخ ہی کیوں نہ ہو، اور کاش آپ مجھ سے راضی ہوں، گو سب انسان ناراض ہی کیوں نہ ہو جائیں، میرے اور آپ کے درمیان کا رشتہ مضبوط اور آباد ہو، چاہے ساری دنیا کے ساتھ میرے تعلقات شکستہ اور ویران ہو جائیں)۔

بناکر دند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مولانا محمد علی جوہرؔ نے اسی تعلق مع اللہ کے بارے میں کیا ہی خوب فرمایا ہے:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

اور اللہ کے ان مقبول بندوں کی صحبت میں بیٹھے والا آخرت کی نعمتوں سے محروم نہ رہے گا:

"اولئک قوم لایشقی بھم جلیسھم" (یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا (اللہ کی رحمت سے) محروم نہیں رہتا۔

"میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے"

میرے عزیزو۔ آج دنیا میں جس چیز کی تلاش نہیں وہ روحانیت ہے، اللہ والوں کی ہمیشہ کمی ہی رہی ہے، اور ان کے قدرداں بھی ہمیشہ کم ہی رہے، بس اب وہ خال خال ہی ہیں جو اللہ والے ہیں، اب ان کو جاننا اور پہچاننا بھی مشکل ہو گیا ہے، اور جو منظر عام پر ہیں ان کا نقشہ حضرت جگر مرادآبادی نے خوب کھینچا ہے:

واعظ کا ہر ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

اور بقول علامہ اقبالؒ۔

پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے
گفتار بے سوز کردار واہی

دراصل اس اخلاص کی کمی کا نتیجہ اخلاق کا فساد ہے۔
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"ألا ان فی الجسد لمضغة اذا صلحت صلح الجسد کله ، واذا فسدت ، فسد الجسد کله ، ألا وهی القلب"

(یاد رکھو انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ صحیح ہوجائے تو سارے جسم کا نظام صحیح ہوجاتا ہے، اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارے جسم کا نظام بگڑ جاتا ہے، یاد رہے! وہ انسان کا دل ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں اس خاکسار کو بہت ساری نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے۔ ان میں ایک صوفیانہ مشرب بھی ہے، اور یہ صوفیانہ مشرب سینہ بہ سینہ چلتا ہے، جس طرح کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اس صوفیانہ مشرب کو میں نے نامی گرامی حضرات کی صحبت میں پایا، جن کا ذکر میں گذشتہ صفحات میں کر چکا ہوں، ان میں، میں نے جن باکمال بزرگوں کو پایا اور جن کی صحبت سے مجھے بڑا فیض ہوا وہ دو بزرگ ہیں، ایک میرے محسن و مربی حضرت مولانا محمد ابراہیم شاہؒ اور دوسرے حضرت العلامہ سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، اور میں ان بزرگوں کو جب یاد کرتا ہوں تو جریر کا شعر یاد آتا ہے:

أولٰئک آبائی فجئنی بمثلهم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

حضرت پیر و مرشد مولانا محمد ابراہیم شاہؒ اس شعر کے مصداق تھے کہ:

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی ہے
گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند

میرے پیر و مرشد جب ذکر کرتے تو پہلے یہ شعر پڑھتے۔

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

پھر دل کھینچ لیتے، پھر تھوڑا ذکر کرتے، پھر یہی شعر پڑھتے اور خوب روتے۔
حضرت مولانا محمد ابراہیم شاہؒ کی یہ اندرونی کیفیت، جذبِ دل و سوز و دردمندی، اور اخلاص وللہیت کا نتیجہ تھی۔

(ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد)۔

ایک بار حضرت نے یہ شعر بڑی ہی رقت سے پڑھا:

اللہ اللہ ہے تو گویا جان ہے
ورنہ یارو جان بھی بے جان ہے

ایک مجلس میں اس شعر کو بار بار دہراتے رہے:

دل ڈھونڈنا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے
اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

ایک بار اللہ سے فریاد کرتے ہوئے حالت وجد میں اس شعر کو پڑھا:

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

ایک بار فرمایا کہ صوفیائے کرام کی بڑی ہی پیاری باتیں ہوتی ہیں، اور اس شعر کو جذبہ، درد و عشق سے پڑھا :

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکداں کئے ہوے

ایک بار میرے غریب خانہ آنے کی حضرت نے بذریعہ خط اطلاع دی تو میں نے فرحت و انبساط کا اظہار کرتے ہوے ایک محبت بھرا خط جواب میں تحریر کیا، اس میں ایک شعر یہ بھی لکھ دیا کہ:

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جب حضرت ممدوح حیدرآباد تشریف لائے تو وہ اس شعر کو محبت بھرے انداز میں دہراتے رہے۔

ایک بار میں نے حضرت سے سلوک نہ ہونے کی شکایت کی اور یہ شعر لکھ کر بھیج دیا۔

یہ کیا ستم ہے کہ حافظؔ تمہارے ہوتے ہوے
ہے میکدہ میں بھی اور تشنہ کام ہے ساقی

حضرت چند دن بعد حیدرآباد تشریف لائے اور خلوت میں بلایا اور دیر تک سینے پر ہاتھ رکھا اور توجہ فرماتے رہے، غرض اس وقت دل کی کیفیت اور تھی اور زبان پر یہ اشعار تھے:

اے نسیم سحری بندگی ما برساں
کہ فراموش مکن وقت دعائے سحرم

ہمّتم بدرقہ راہ کن اے طائر قدس
کہ دراز است رہ مقصد و من نو سفرم

پھر سلاسل اربعہ میں خلافت سے سرفراز فرمایا۔

(ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم)

غرض، میرے پیر و مرشد حضرت مولانا محمد ابراہیم شاہؒ کی ذات میں، اخلاص، تعلق مع اللہ، زہد و توکل، استقامت علی الشریعۃ، عشق و محبت الہیٰ، علوم صحیحہ اور تحقیقات عالیہ اور حضرت کی تاثیر صحبت اور اصلاح و ارشاد کے وہ اعلیٰ نمونے تھے، جو کشوف و کرامات اور واقعات غریبہ سے اعلیٰ وارفع ہیں۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چوں غلام آفتابم ہمہ از آفتاب گویم

حضرت مولانا محمد ابراہیم شاہؒ کی وفات کے بعد میں نے حضرت العلامہ سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے بیعت و ارادت کا شرف پایا، حضرت ممدوح نے

بیعت کے موقع پر یہ الفاظ تلقین فرمائے:

"کہو **بسم اللہ الرحمن الرحیم، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ**

یا اللہ ہم توبہ کرتے ہیں کفر سے، شرک سے، بدعت سے، زنا سے، چوری سے، غیبت سے، جھوٹ بولنے سے، نماز چھوڑنے سے اور ان سب گناہوں سے جن کا ہم نے اپنی ساری عمر میں ارتکاب کیا خواہ وہ گناہ چھوٹے ہوں یا بڑے، اور اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ تیرے سارے احکام مانیں گے، تیرے رسول پاک کی تابعداری کریں گے، یا اللہ تو ہماری توبہ قبول کر، ہمارے گناہوں کو بخش دے، اپنی رضامندی کی اور، اپنے رسول پاک کی تابعداری کی توفیق دے"۔

(یہ کلمات دار صل چھٹے کلمہ کا خلاصہ ہے)۔

حضرت العلامہ مدظلہ کی ذات میں، میں نے عظیم کمالات دیکھے، آپ کی ذات میں جام شریعت کے ساتھ، سندان عشق کی کارفرمائی دیکھی، پھر دور جام چلنے لگا:

در کف جام شریعت در کف سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

حضرت ممدوح کے کمالات کا ذکر گذشتہ صفحات میں، میں لکھ چکا ہوں، آپ کی ذات بابرکات شریعت و طریقت اور معرفت کی جامع ہے اور آپ کی ذات میں تعلق مع اللہ، اخلاص، زہد و توکل، عشق و محبت الہٰی ہے اور آپ میں امت کی فکر، تحریر و تقریر میں کمال، علم و عمل، حسب و نسب کی جامعیت ہے، اور آپ کی ذات میں اخلاق حمیدہ کے وہ اعلیٰ نمونے ہیں جو اہل اللہ کے خاص اوصاف ہوتے ہیں۔

حضرت ممدوح نے ایک بار اپنے مسترشدین سے خطاب فرمایا اور اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوریؒ کے مبارک کلمات کو دہراتے ہوئے فرمایا:

"جماعت کا وجود افراد پر ہے، اور اجتماعی اصلاح انفرادی اصلاح پر موقوف ہے، اور مصلح سے پہلے صالح بننا ضروری ہے"۔

"ومن أحسن قولا ممن دعا الی الله و عمل صالحا و قال اننی من المسلمین" کی گویا یہ تشریح تھی۔

ایک بار بڑے درد بھرے انداز میں آپ نے یہ شعر پڑھا :

یہ سرائے دہر مسافرو ، بخدا کسی کا مکاں نہیں
جو مقیم اس میں تھے کل یہاں ، کہیں آج ان کا نشاں نہیں

ایک بار حضرت ممدوح نے اپنے پیر شیخ عبدالقادر رائے پوریؒ کے وصال کا ذکر فرماتے ہوئے آہ بھری اور فرمایا کہ جب آپ کی زندگی کا ورق تمام ہو رہا تھا تو جیسے "دن گنے جاتے تھے جس دن کے لئے" اور وہ سفر آخرت میں ایسے چلے جیسے "رات بھر کا چلا مسافر صبح منزل مقصود پر پہنچ کر آرام کرتا ہے"۔

"یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا"

یا أیتها النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیه فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی ○

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

غرض ان اللہ والوں کی شان ایسی ہی ہے جیسے :

حسن کی جنس خریدار لئے پھرتی ہے
ایک بازار کا بازار لئے پھرتی ہے

اور ان بزرگوں کی فکرِ دلسوزی گویا :

شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

اور جس طرح حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے اپنے مرید حضرت نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ کے لئے پڑھا تھا :

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جاناں خراب کردہ

ان اہل اللہ کا جلال و جمال و کمال ، اتباعِ شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پنہاں ہے ۔ جیسے کہ ارشاد ہوا " **قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم** " ○

کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اور یہ مقام بلند صرف وابستگی و سپردگی میں ہے :

وابستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

غرض ان اہل اللہ کی تعریف و توصیف ہم سے کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔

خاتمۂ کلام :

قلم بشکن ، سیاہی ریز ، کاغذ سوز ، دم درکش
کہ حسنِ قصۂ عشقست ، در دفتر نمی گنجد

محمد غوث ندوی

مدینہ منورہ

۳۰/ اکتوبر ۱۹۹۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب (۴۲)

(وصیت نامہ من)

کلماتِ وصیت

(۱)

میری پیدائش اواخر دسمبر ۲۵/ ۱۹۴۰ء مطابق ۱۱/ ربیع الثانی ۱۳۶۰ ہجری میں ہوی، اور وصیت نامہ لکھنے کا خیال یکم ستمبر ۱۹۹۶ء یعنی (۱۴۱۷ ہجری) میں پیدا ہوا، چنانچہ خوب خیال ہے کہ روتی ہوئی آنکھوں اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے یہ مسودہ لکھ رہا ہوں، اس وقت سن ۵۷ کا ہے۔

---

(۲)

کلمات وصیت ۲۷/ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو دوبارہ مکہ مکرمہ میں کعبۃ اللہ شریف کے سامنے بیٹھ کر بغور مطالعہ کیا، اور دوبارہ حرم محترم میں تحریر کیا گیا، اور اس وصیت نامہ کا وہ حصہ جو "ترکہ و خانگی امور" کے متعلق ہے حرم میں ہی تحریر کیا گیا، جو علٰحدہ طبع کیا جاکر اولاد میں محفوظ کیا جائے گا۔

ان شاء اللہ تعالیٰ

---

(۳)

میرا جنازہ پڑھانے کے لئے نمبر ایک پر میری صالح اولاد میں سے کسی کو، پھر مولوی محمد اقبال امیر تبلیغی جماعت لاس اینجلس امریکہ کو رکھتا ہوں، وہ نہ ملیں تو حافظ قاری شاہ فیض علی امام مسجد جبرئیل کو، اور وہ بھی نہ ملیں تو حافظ قاری ظفر اللہ خاں امام مسجد دار العلوم الاسلامیہ بامریکا کو، ورنہ پھر کسی صالح مسلمان کو ہی، مدفن کے لئے اصلی تمنا (حرمین شریفین) کی ہے۔ اگر امریکہ میں موت واقع ہو تو مسلمان قبرستان میں تدفین عمل میں لائی جائے، اور اگر وقت موعود امریکہ سے باہر کہیں ہوجائے تو وہاں سے لاشہ لانے کی زحمت و طوالت ہرگز گوارا نہ فرمائی جائے۔ قبر پختہ نہ ہو۔

قبر پر نام "محمد غوث ندوی" یا "ایک کلمہ گو مسلمان" ہو تو بہتر ہے۔ اور بہ طور کتبہ یہ آیتیں ضرور لکھ دی جائیں۔

(۱) وربک الغفور ذوالرحمۃ ○

(۲) قل یا عبادی الذین أسرفوا علی أنفسهم لاتقنطوا من رحمة الله ان الله یغفر الذنوب جمیعا انه هو الغفور الرحیم ○

اپنے مخلصین سے طمع اس کی رکھتا ہوں کہ دعائے مغفرت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں، اور صالحین امت سے دعائے مغفرت ضرور کرائی جائے۔

---

(۴)

دل میں آرزوئیں ہزاروں ہیں اور حسرتیں بے شمار، اتنا اعتراف تو مجھ جیسے ناشکرے کو بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عمر تک اپنے ہر طرح کے لطف و کرم سے نوازے رکھا، اور ہر قسم کی نعمت سے سرفرازی دی، اپنے استحقاق و قابلیت سے کہیں بڑھ کر، اپنے کمال ستاری سے خلق میں رسوا ہونے سے بچائے رکھا، آخرت میں تو یہ صفت ستاری کہیں ----- بڑھ چڑھ کر ہوگی، وہاں کیسے اپنے فضل و کرم سے محروم رکھے گا۔

فاستغفری لذنبک یانفس وامتدی
بالله ، ان ربک یهدی لمن یشاء

سارا بھروسہ، سارا ناز، سارا اعتماد بس ایک ذاتِ والا صفات پر ہے، جس نے اپنا نام "العفو" بھی بتایا ہے اور "الغفور" بھی، اور "الغفار" بھی، اور جس کی مغفت رحمت سب سے وسیع ہے "ان رحتمی وسعت کل شیئ" اور "ان رحمتی سبقت غضبی" اور "کتب علی نفسه الرحمة" جس کی شایان شان ہے اور جس نے بے شمار شہادتیں بھی اس کی اپنے سچے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ امت تک پہنچادی ہیں، ورنہ اپنے اصل حال کے لحاظ سے کسی کو اپنا

چہرہ نہ دکھاؤں ، اتنے دن جیا اور نہ حقوق اللہ کی ادائیگی کی توفیق ہوی ، اور نہ حقوق العباد کی !

عزیزو ، مخلصو ، رفیقو ! ، بس اب اللہ حافظ ،

دم واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو ! اب اللہ ہی اللہ ہے

یغفر اللہ لنا ولکم ، ان شاء اللہ العزیز ملاقات جس میں کسی قسم کا خلل نہیں پڑے گا ، اب جنت ہی میں ہوگی ۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد غوث ندوی

○○○○○○○

بسم اللہ الرحمن الرحیم

منزل بہ منزل

تسلسل	مضمون	صفحہ
(۱)	حرف آغاز	۲
	[باب : ۱]	
(۲)	ماحول	۴
(۳)	پڑدادا	۶
(۴)	جدامجد	۷
(۵)	خاندانی شجرہ	۷
	[باب : ۲]	
(۶)	والد ماجد	۸
	[باب : ۳]	
(۷)	والدہ ماجدہ	۱۴
	[باب : ۴]	
(۸)	بھائی بہن	۱۹
	[باب : ۵]	
(۹)	دوسرے اعزّہ و اقارب	۲۱
(۱۰)	والدین سے جدائی اور مدرسہ میں داخلہ	۲۲

[باب : ۶]

(۱۱) میری پیدائش ۲۶

[باب : ۷]

(۱۲) حکومت آصفیہ کا زوال (یعنی پولیس ایکشن) ۳۵

(۱۳) والدہ صاحبہ سے جدائی کے پانچ سال
بعد ملنے کا جذباتی منظر ۳۸

[باب : ۸]

(۱۴) فضل ربانی ۴۰

[باب : ۹]

(۱۵) میٹرک (دسویں جماعت) کی تیاری ۴۶

(۱۶) پہلا دورۂ مدراس ۴۷

[باب : ۱۰]

(۱۷) ۲۸/ رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ کو
مقابلہ قراءت اور عمدۃ القراء کا خطاب ۴۹

(۱۸) مدراس کے چیدہ چیدہ حالات ۵۲

(۱۹) زندگی کی رفتار ۵۳

[باب : ۱۱]

(۲۰) زندگی کا ایک نیا باب
(حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کی مدراس میں آمد) ۵۵

(۲۱) دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو ۵۷

(۲۲) طالب علمی کی زندگی کا خلاصہ ۶۲

(۲۳) دار العلوم ندوۃ العلماء سے جدائی ۶۴

[باب : ۱۲]
(۲۴) جستجوئے معاش ۶۵

[باب : ۱۳]
(۲۵) ازدولجی زندگی (حصہ اول) ۶۷
(۲۶) ملیشیا کے عالمی مقابلہ۔ قراءت میں شرکت ۶۸
(۲۷) ازدولجی زندگی کا پہلا باب ۶۹

[باب : ۱۴]
(۲۸) شادی خانہ آبادی ۷۲

[باب : ۱۵]
(۲۹) دیگر حالات زندگی اور جامعات کے امتحانات کا سلسلہ ۷۶

[باب : ۱۶]
(۳۰) ازدولجی زندگی (حصہ دوم) ۸۰

[باب : ۱۷]
(۳۱) ازدولجی زندگی (حصہ سوم) ۸۴

[باب : ۱۸]
(۳۲) ازدولجی زندگی (حصہ چہارم) ۸۶

[باب : ۱۹]
(۳۳) امریکہ آنے کا دعوت نامہ ۹۰
(۳۴) حج بیت اللہ و زیارت مدینہ منورہ کی
سعادت اور اس سلسلہ کی غائبانہ تائید ۹۱

[باب : ۲۰]

(۳۵) حج بیت اللہ ۹۳

(۳۶) مکہ مکرمہ ۹۴

(۳۷) مدینہ منورہ ۹۴

(۳۸) حجاز مقدس میں دوبارہ حاضری ۹۷

[باب : ۲۱]

(۳۹) امریکہ کو دوبارہ روانگی ۹۷

(۴۰) دار العلوم الاسلامیہ بامریکا ۹۸

[باب : ۲۲]

(۴۱) دار العلوم الاسلامیہ بامریکا کے قیام کی مستقلاً کوشش ۹۹

[باب : ۲۳]

(۴۲) تحریر و تقریر ۱۰۲

(۴۳) مضمون نگاری ۱۰۴

[باب : ۲۴]

(۴۴) تصنیفات و تالیفات ۱۰۶

[باب : ۲۵]

(۴۵) تعلیم و تعلم ۱۱۱

[باب : ۲۶]

(۴۶) معاشی و مالی زندگی ۱۱۴

[باب : ۲۷]

(۴۷) شعر و شاعری ۱۱۴

[باب : ۲۸]
(۴۸) سیاسی زندگی ۱۲۴

[باب : ۲۹]
(۴۹) بیعت وارادت ۱۲۶

[باب : ۳۰]
(۵۰) سفر ۱۳۰

[باب : ۳۱]
(۵۱) صحت جسمانی ۱۳۳

[باب : ۳۲]
(۵۲) عام معیشت اور عادات واطوار ۱۳۵

[باب : ۳۳]
(۵۳) موثر، محسن، عزیز شخصیتیں ۱۳۸

[باب : ۳۴]
(۵۴) نامی گرامی عظیم شخصیتیں ۱۴۵

[باب : ۳۵]
(۵۵) مخالفین و معاندین ۱۴۷

[باب : ۳۵/الف]
(۵۶) اولاد ۱۵۱

[باب : ۳۶]
(۵۷) دینی تحریکیں اور ان سے اثر پذیری ۱۵۳
(۵۸) تبلیغی جماعت ۱۵۳

(۵۹) جماعت اسلامی ۱۵۶
(۶۰) کل ہند مجلس تعمیر ملت ۱۵۷

[باب : ۳۷]

(۶۱) غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ ۱۶۰

[باب : ۳۸]

(۶۲) تبلیغ اسلام اور ہماری ذمہ داری ۱۶۷

[باب : ۳۹]

(۶۳) روداد تبلیغی سفر
(زندگی کا سب سے خوشگوار پہلو) ۱۷۵

[باب : ۴۰]

(۶۴) اپنی اولاد، ذریت، شاگرد اور دوست
احباب کو چند مخلصانہ ہدایتیں ۱۷۹
(۶۵) حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے چند حکیمانہ مقولے ۱۸۱
(۶۶) عام نتائج و تجربات زندگی کا نچوڑ ۱۸۳

[باب : ۴۱]

(۶۷) زندگی کا خلاصہ و عطر ۱۸۸
(۶۸) خاتمہ۔ کلام ۱۹۹

[باب : ۴۲]

(۶۹) کلمات وصیت ۲۰۰
(۷۰) منزل بہ منزل (فہرست) ۲۰۴

OOOOO

اردو کمپیوٹر سنٹر

دنیا کی بلند و بالا عمارت

" THE SEARS TOWER" سے آگے

۱۲۵ کتابوں کی اردو کمپیوٹر کتابت ـــــ ایک عالمی ریکارڈ

ماضی میں کسی کتاب کی اشاعت ایک ایسا خواب تھی جس کی تعبیر جوئے شیر لانے سے کم نہ تھی۔ اب برق رفتار کمپیوٹرز کے ذریعے ضخیم سے ضخیم کتاب پلک جھپکتے ، موتیوں کی طرح خوبصورت رسم الخط میں دیدہ زیب حائل کے ساتھ زیور طباعت سے آراستہ کر کے منظر عام پر لائی جا سکتی ہے۔

ڈسمبر ۹۳ سے اگست ۹۶ تک ۱۲۵ سے زیادہ کتابوں کی اردو کمپیوٹر کتابت کر کے " اردو کمپیوٹر سنٹر " ترقی کی منزلیں عبور کرتے ہوئے دنیا کی سب سے بلند و بالا عمارت "THE SEARS TOWER" (سیرس ٹاور شکاگو امریکہ) کی بلندی سے بھی آگے بڑھ کر رفعتوں سے کھیلتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے جس کے لیے اللہ عزوجل کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

کتابت سے طباعت تک کے سارے مراحل ہمارے ذمے

اردو ، عربی ، فارسی اور انگریزی ـــــ چار زبانوں میں عمدہ ، نفیس ، دیدہ زیب ، خوبصورت کمپیوٹر کتابت ، روزانہ سو صفحات کی رفتار ، واجبی اجرت ، وقت کی پابندی ہمارا نصب العین ہے رابطہ قائم کریں۔

4530850

جلال الدین اکبر فون نمبر : اردو کمپیوٹر سنٹر

17-1-181/M/35, OPP JAMIA AISHA NISWAN (New Building)
DARAB JUNG COLONY MADANNAPET HYD 500059 (A.P.)

ہماری دیگر مطبوعات

(زبان اردو)

- کتاب التبصرۃ (علی بن ابی طالب)
  علمی تحقیق (مقدمہ) و تعلیق و تصحیح
- مسند عائشہ (رضی اللہ عنہا)
- مسانید امہات المؤمنین (رضی اللہ عنہن)
- مسانید الصحابیات (رضی اللہ عنہن)
- غزوات النبی صلی اللہ علیہ وسلم
  فی ضوء القرآن والاحادیث
  (حیاۃ الشیخ محمد انوار اللہ)

(زبان عربی)

- سیرت شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم
- نشریات و شخصیات

حافظ وقاری مولانا ڈاکٹر محمد غوث ندوی
بانی و ناظم دار العلوم الاسلامیۃ بأمریکا
کیلیفورنیا۔ امریکہ